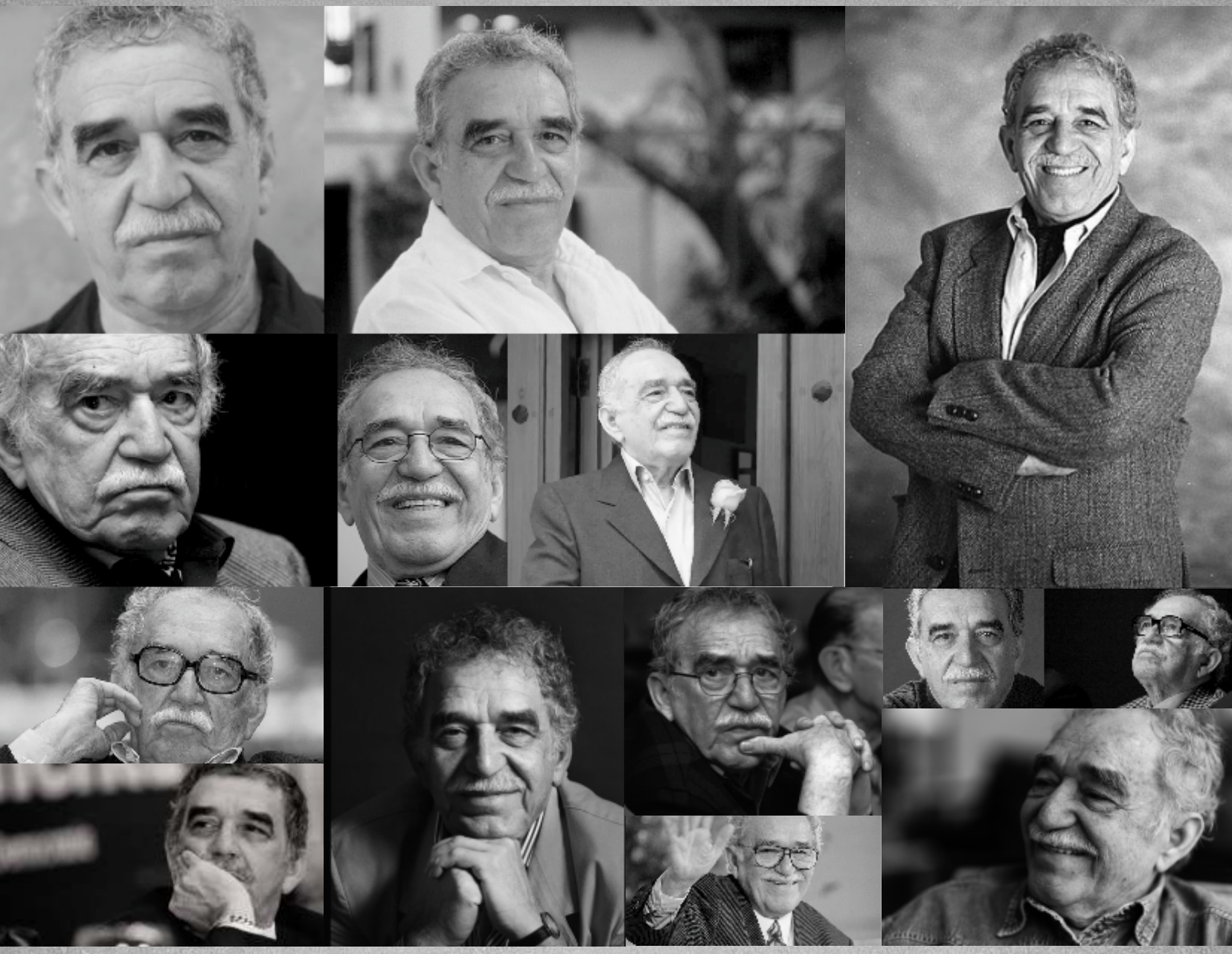

اردو کے مایۂ ناز ادیبوں اور شاعروں کی تاریخ پیدائش (اپریل)

ابن صفی

کلام حیدری

آغا حشر کاشمیری

جگر مرادآبادی

کشمیری لال ذاکر

منیر نیازی

امام بخش ناسخ

ابو محمد سحر

الیاس احمد گدی

زبیر رضوی

عشرت رحمانی

روؤف رضا

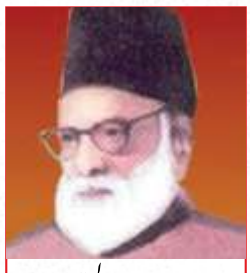
مولوی عبدالحق

احتشام حسین

کفیل آزر

ابن صفی	یکم اپریل ۱۹۲۸	۲۶ر جولائی ۱۹۸۰
ذکاءاللہ دہلوی	یکم اپریل ۱۸۳۲	۷ر نومبر ۱۹۱۰
ڈاکٹر شریف احمد	یکم اپریل ۱۹۳۰	۲۰ر جولائی ۲۰۱۲
کلام حیدری	۲ر اپریل ۱۹۳۰ء	
آغا حشر کاشمیری	۴ر اپریل ۱۸۷۹	۲۸ر اپریل ۱۹۳۵
اسماعیل پانی پتی	۴ر اپریل ۱۸۹۳	۱۲ر اکتوبر ۱۹۷۲
سیدہ جعفر	۵ر اپریل ۱۹۳۴ء	۲۴ر جون ۲۰۱۶
سلیمان اریب	۵ر اپریل ۱۹۲۲	۷ر ستمبر ۱۹۷۰

جگر مرادآبادی	۶ر اپریل ۱۸۹۰	۹ر ستمبر ۱۹۶۰
کشمیری لال ذاکر	۷ر اپریل ۱۹۱۹	۳۱ر اگست ۲۰۱۶
جعفر عباس	۷ر اپریل ۱۹۴۳	۱۶ نومبر ۲۰۰۳
ل۔ اکبر آبادی	۸ر اپریل ۱۸۸۵	۶ر جون ۱۹۸۰
منیر نیازی	۹ر اپریل ۱۹۲۸	۲۶ر دسمبر ۲۰۰۶
ناسخ	۱۰ر اپریل ۱۷۷۲	۱۶ر اگست ۱۸۳۸
ابو محمد سحر	۱۰ر اپریل ۱۹۲۸	۲۹ر اپریل ۲۰۰۲
الیاس احمد گدی	۱۴ر اپریل ۱۹۳۲	۲۷ر جولائی ۱۹۹۷

زبیر رضوی	۱۵ر اپریل ۱۹۳۵	۲۰ر فروری ۲۰۱۶
نشور واحدی	۱۵ر اپریل ۱۹۱۲	۴ر جنوری ۱۹۸۳
ہرچند اختر	۱۵ر اپریل ۱۹۰۰	یکم جنوری ۱۹۵۸
عشرت رحمانی	۱۶ر اپریل ۱۹۱۰	۱۳ر مارچ ۱۹۹۲
روؤف رضا	۱۸ر اپریل ۱۹۵۴	۲ر دسمبر ۲۰۱۶
مولوی عبدالحق	۲۰ر اپریل ۱۸۷۰	۱۶ر اگست ۱۹۶۱
احتشام حسین	۲۱ر اپریل ۱۹۱۲	یکم دسمبر ۱۹۷۲
کفیل آزر	۲۳ر اپریل ۱۹۴۰	۲۸ر نومبر ۲۰۰۳

بشکریہ 'قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان'

جلد : ۷۲ شمارہ : ۱۲

ماہنامہ **نیا دور** لکھنؤ

اپریل ۲۰۱۸ء

پبلشر: انج کمار جھا

ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات ورابطہ عامہ، اتر پردیش

ایڈیٹر

سہیل وحید

فون: 9415007694

Ph. No. 2239132 Ext. 228

Email: nayadaurmonthly@gmail.com

معاون

شاہد کمال

رابطہ برائے سرکولیشن وزرِ سالانہ

صبا عرفی

فون: 7705800953

تزئین کار : وقار حسین

مطبوعہ: پرکاش پیکیجرس، گولہ گنج لکھنؤ

شائع کردہ: محکمۂ اطلاعات ورابطۂ عامہ، اتر پردیش

زرِ سالانہ : ۱۱۰/روپے

ترسیل زر کا پتہ

ڈائرکٹر

انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ

پارک روڈ، اتر پردیش، لکھنؤ 226001

Please send Cheque/Bank Draft in favour of Directer, Information & Public Relations Department, UP, Lucknow

خط وکتابت کا پتہ

ایڈیٹر نیا دور، پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱

بذریعہ کوریئر یا رجسٹرڈ پوسٹ

ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ

۶ پارک روڈ، سوچنا بھون، اتر پردیش، لکھنؤ 226001

اس شمارے میں...

مرزا جعفر حسین

جاگیرداری نظام نے دم توڑ دیا
صفحہ ۴۹

گابرئیل گارسیا مارکیز

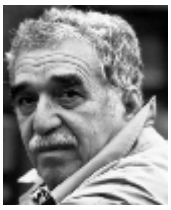

تنہائی کے سو سال
صفحہ ۱۵

پیٹریشیا ہائی اسمتھ

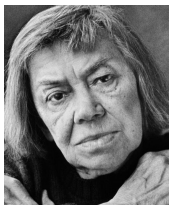

ڈانسر
ص ۵۵

مسرور جہاں

نقل مکانی
صفحہ ۲۷

حبیب الرحمن چغانی

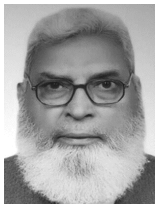

ٹوپی
صفحہ ۵۹

ف۔س۔اعجاز

افسانچے
صفحہ ۲۹

شموئیل احمد

سراب
صفحہ ۳۴

خالد جاوید

تنہائی کے سو سال
صفحہ ۱۱

پربھات رنجن

جادو بھری مشکلوں بھرا تھامارکیز کا بچپن
صفحہ ۵

مستجاب شیلی

بری عورت
صفحہ ۴۳

شبنم پروین

خوار مسیحا
صفحہ ۴۶

رومی ملک

بدرامت برسوموے انگنا
صفحہ ۳۹

سپنا مانگلک

بندیا
صفحہ ۵۳

ادیب اختر

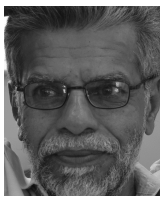

جونک
صفحہ ۵۷

نیا دور میں شائع ہونے والے تمام تر مشمولات میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے، اس کی پوری ذمہ داری مصنف کی ہے۔ حکومت اتر پردیش کا متفق ہونا بہر حال ضروری نہیں ہے۔

اپنی بات

ہماری روزمرہ کی زندگی میں سائنسی آلات کے بڑھتے عمل ودخل کا احساس ہونے کے باوجود ہم نادانستہ اور غیر فطری طور پر روز بہ روز اس پر منحصر ہوتے جارہے ہیں۔ ہمیں احساس ہی نہیں ہوتا کہ ہم کب ان آلات کی گرفت میں آگئے اور ان کے غلام ہوکر رہ گئے۔ آج کی زندگی، گھر ہو یا باہر، ہم ان آلات کے بغیر اپنے آپ کو نامکمل محسوس کرتے ہیں گویا کہ ہم اپنے تمام شعبہ ہائے حیات میں حتیٰ کہ عبادت اور محبت میں بھی ان آلات کے عادی ہو چکے ہیں۔

زندگی جب اس قدر سائنسی آلات وتکنیک کے آہنی جال کی گرفت میں آچکی ہو تو کیا یہ غیر فطری نہیں محسوس ہوتا کہ ہماری اردو زبان اب بھی سائنسی تخلیقات پر منحصر ادب سے محروم کیوں ہے۔ ہمیں یہ احساس کیوں نہیں ہے کہ ہم دراصل سائنسی عہد میں سانس لے رہے ہیں اور اکثر و بیشتر ہماری یہ سانس بھی سائنسی آلات کی مرہون منت ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود ہمارا اردو ادب سائنسی تخلیقات کے اسرار و رموز پر اکثر خاموش ہے۔

اردو ہی نہیں ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی سائنس پر مبنی ادب کمیاب ہے۔ اردو چونکہ تمام دوسری ہندوستانی زبانوں کے مقابلے عالمی پیمانے پر زیادہ بڑے حلقہ میں بولی اور پڑھی جاتی ہے اور ترقی یافتہ ممالک میں ہزار ہا اردو شعبے قائم ہیں۔ اس لئے اردو سے کچھ زیادہ ہی امید وابستہ ہو گئی ہے لیکن جیسی امید تھی ویسا کچھ حاصل نہیں ہو پا رہا ہے حالانکہ غالبؔ نے بہت پہلے ہی سوال کیا تھا:

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

اکبرؔ الٰہ آبادی نے بھی زندگی پر سائنس کی بڑھتی گرفت کو وقت رہتے محسوس کر لیا تھا:

اس کا پیچنا ہے اور اس کے ہیں بپھارے
یورپ نے ایشیا کو انجن پہ رکھ لیا ہے

علامہ اقبالؔ نے بھی 'بانگ درا' اور 'لینن خدا کے حضور میں' میں ایسے اشعار کہے ہیں جن میں سائنس کی اہمیت کو تسلیم کیا گیا ہے لیکن اس کے بعد کے اردو ادب میں سائنس، سائنسی ایجادات اور تکنیک وغیرہ پر سیر حاصل اور خاطر خواہ سائنسی رجحان والے ادب کی تخلیق نہیں ہو پائی۔

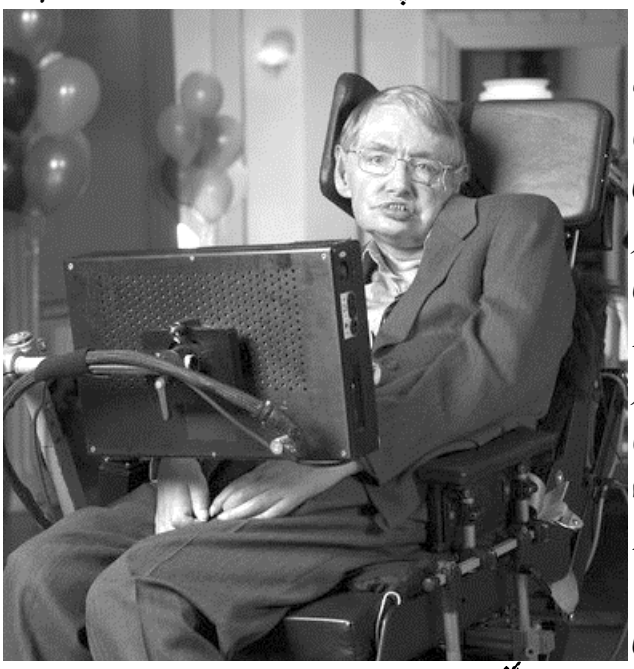

پیدائش: ۸/جنوری ۱۹۴۲ء **وفات:** ۱۴/مارچ ۲۰۱۸ء

حال ہی میں معروف سائنسداں اسٹفین ہاکنگ کے انتقال پر بھی اردو ادب میں کچھ ایسا ہی محسوس ہوا۔ سائنس کے بارے میں عام فہم سوالوں کے سہل انداز میں جواب دے کر سائنس کو عوام سے قریب تر کرنے والے اس سائنسداں کی تخلیقات بھی اردو میں تقریباً ناپید ہیں۔

اسٹیفن ہاکنگ کو نظریاتی فزکس میں آئن اسٹائن کے بعد سب سے باصلاحیت سائنسدانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ۱۹۶۳ء میں جب وہ محض ۲۲ برس کے تھے تو تشخیص کیا گیا کہ انہیں 'موٹر نیوران' جیسی مہلک بیماری ہے تو اس وقت طبی ماہرین نے پیشینگوئی کی تھی کہ وہ صرف چند ماہ ہی زندہ رہ سکیں گے۔ میڈیکل سائنس کے مطابق اس بیماری کے شکار صرف پانچ فیصد لوگ ہی اس مرض کی تشخیص کے بعد ایک دہائی سے زیادہ عرصہ تک زندہ نہیں رہ سکے اور چند سالوں کے اندر مر گئے جب کہ اسٹیفن ہاکنگ اس بیماری کے ساتھ تقریباً نصف صدی تک زندہ رہے۔ ان کی زیست کے یوں رواں دواں رہنے کو 'معجزہ' سے کم تسلیم نہیں کیا گیا۔

۱۹۷۴ء میں انہوں نے نظریہ پیش کیا کہ خلاء میں بلیک ہولز، ریڈی ایشن خارج کرتے ہیں۔ بلیک ہولز کی ان کی یہ تھیوری کافی مشہور ہوئی کہ کہکشاں کے وسط میں ایک درجن بلیک ہولز ہیں اور ان بلیک ہولز کے ارد گرد نظر نہ آنے والے ستارے گردش کرتے رہتے ہیں۔ ہماری کہکشاں کے بیچ بہت بڑا بلیک ہول ہے جس کے ارد گرد گیس اور غبار ہے جو بڑے ستاروں کے پنپنے کی بہترین جگہ ہیں۔ یہ ستارے وہیں رہتے ہیں، وہیں مرتے ہیں اور بلیک ہولز میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

اسٹیفن ہاکنگ سے پہلے بھی ماہرین فلکیات نے بلیک ہولز کے بارے میں بتایا تھا کہ یہ روزن سیاہ (بلیک ہولز) ۱۳ بلین نوری سال کے فاصلے پر ہیں اور ہم سب کے سمجھنے کے لئے یہ کہا گیا تھا کہ بگ بینگ کے واقعہ کے ۶۹۰ ملین سال بعد انسان اسے دیکھ پائے ہیں۔ اسٹیفن ہاکنگ کے روزن سیاہ سے متعلق تقریباً سبھی نظریات کی پوری دنیا میں تعریف وتوصیف ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ ایک مخصوص قسم کی خودکار کرسی پر محدود ہونے کے باوجود انہوں نے دنیا کی مختلف یونیورسٹیوں میں خطبے دئے۔ ۲۰۰۱ء میں وہ

۱۶ دن کے لئے ہندوستان آئے۔ انہوں نے اپنے ایک لیکچر میں تب کہا تھا:

'ہندوستان کے لوگ حساب اور فزکس میں غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں۔'

یہ بات بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ اسٹیفن ہاکنگ اپنے ایک سافٹ ویئر کو اپڈیٹ کرنے کے لئے ایک ہندوستانی سافٹ ویئر انجینئر 'ارون مہتا' کی خدمات حاصل کرتے تھے۔ انہوں نے اپنی ۵۹ ویں سالگرہ بھی ممبئی میں منائی اور اپنی اسی مخصوص وہیل چیئر پر بیٹھ کر ممبئی شہر کی سیر کی۔

اسٹیفن ہاکنگ جب تب ایسی باتیں کہہ دیتے تھے کہ دنیا چونک جاتی تھی مثلاً ۲۰۱۰ء میں انہوں نے کہا:

'کرۂ ارض محض دو سو سال کا مہمان رہ گئی ہے، بڑھتی آبادی، کم ہوتے وسائل، مشینی ذہانت اور ایٹمی اسلحوں کا غیر معقول مینجمنٹ... اس کا سبب بن سکتے ہیں۔'

تقریباً پوری طرح سے معذور اور پیچیدہ یہ شخص ہمارے عہد کا بہت بڑا سائنسداں تھا جس نے اپنی سنتھیٹک آواز کے ذریعہ وہ سب کہہ دیا جو بڑے سے بڑے قلمکار اور مقررین نہ کہہ سکے۔ یہ وہی شخص تھا جس نے ایک بار کہا تھا:

'اگر یہ کائنات ان لوگوں کا گھر نہ ہوتی جن سے آپ محبت کرتے ہیں تو یہ ایسی نہ ہوتی۔'

اسٹیفن ہاکنگ نے اپنی موت سے تقریباً ڈیڑھ برس قبل کہا تھا:

'انسانیت کو انسان کی اپنی تخلیقات کی وجہ سے خطرات کا سامنا ہے۔'

اسٹیفن ہاکنگ ہی وہ سائنسداں تھا جس نے کہا تھا:

'کبھی بھی کام کرنا نہیں چھوڑنا چاہئے۔ یہ کام ہی آپ کو جینے کا مقصد دیتا ہے۔'

ان کا ایک اور قول ہے کہ:

'اگر آپ خوش قسمت ہیں اور زندگی میں آپ کو محبت مل گئی تو کبھی بھی اسے خود سے الگ مت کریئے۔'

اور اپنی معذوری سے متعلق بھی انہوں نے کیا عمدہ بات کہی ہے:

'آپ کو اپنے جسم کی کوئی بھی کمی کچھ بھی اچھا کرنے سے نہیں روک سکتی، اس کا کبھی افسوس نہیں ہونا چاہئے۔ حالانکہ اپنے کام کرنے کی جستجو میں معذور ہونا بری بات ہے۔'

یہ اقوال کیا کسی سائنسداں کے معلوم پڑتے ہیں؟ لیکن ہیں، ظاہر ہے کہ اس عہد کے بیحد مقبول ومعروف سائنسداں اسٹیفن ہاکنگ کی طبیعت میں ایسا کچھ ضرور تھا جس کے سبب وہ سائنس سے شغف رکھنے کے باوجود ایک تخلیق کار بھی تھے اور ایسے تخلیق کار جو صرف سائنس پر مبنی مواد نہیں لکھتے تھے۔ ان کی کتاب 'دی گرینڈ ڈزائن' میں انہوں نے ثابت کیا کہ قوت کشش ہی دراصل پوری کائنات کا ماحصل ہے۔

نیا دور فیس بک اور واٹس اپ پر بھی

نیا دور کے شمارے مئی تا حال فیس بک اور واٹس اپ پر قارئین کے مطالعہ لئے پوسٹ کر دئے گئے ہیں اور آئندہ بھی یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

اسٹیفن ہاکنگ نے اپنی پلکوں کے ذریعہ بے شمار کتابیں لکھیں، 'کوانٹم گریویٹی' اور کائناتی سائنس (کاسالوجی) کو نیا فلسفہ اور نئی زبان دی۔ ان کی کتاب 'اے بریف ہسٹری آف ٹائم' نے پوری دنیا میں تہلکہ مچا دیا تھا، یہ کتاب تقریباً پانچ سال تک دنیا کی سب سے زیادہ فروخت ہونے والی کتابوں میں شامل رہی۔ لوگوں نے ایک ادبی شاہکار کے طور پر اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔

ہاکنگ نے اپنی معذور زندگی کی مایوسیوں سے سبق لیتے ہوئے دنیا کے مایوس لوگوں کو زندگی کی خوبصورتی سے آشنا کرانے کی کوشش کی۔ اسٹیفن ہاکنگ کے لیکچرس کے لئے دنیا کی بڑی بڑی کمپنیاں، اور ادارے انتظار کرتے تھے۔ عالم یہ تھا کہ انہیں وہیل چیئر سمیت سیکڑوں، ہزاروں افراد کے سامنے اسٹیج پر بٹھا دیا جاتا اور وہ کمپیوٹر کے ذریعہ لوگوں سے مخاطب ہوتے تھے۔ انہوں نے اپنی ایک تقریر میں کہا:

'اگر میں اس معذوری کے باوجود کامیاب ہو سکتا ہوں، اگر میں میڈیکل سائنس کو شکست دے سکتا ہوں، اگر میں موت کا راستہ روک سکتا ہوں تو تم لوگ جن کے سارے اعضاء سلامت ہیں، جو چل سکتے ہیں، جو دونوں ہاتھوں سے کام کر سکتے ہیں، جو کھا پی سکتے ہیں، جو قہقہہ لگا سکتے ہیں اور جو اپنے تمام خیالات دوسرے لوگوں تک پہنچا سکتے ہیں وہ کیوں مایوس ہیں۔'

اسٹیفن ہاکنگ کا پورا جسم مفلوج تھا، صرف پلکوں میں زندگی کی رمق باقی تھی، طبی ماہرین نے 1974ء میں ہاکنگ کو 'الوداع' کہہ دیا تھا لیکن اس عظیم انسان نے شکست تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ مفلوج جسم کے ساتھ اسٹیفن ہاکنگ نے اپنی نیم مردہ پلکوں پر ہی زندہ رہنے، آگے بڑھنے اور عظیم سائنسداں بننے کا خواب دیکھا۔ وہیل چیئر پر بیٹھے ہوئے اس شخص نے کائنات کے رموز کھولے تو دنیا حیران رہ گئی۔

کیمبرج کے سائبر ماہرین نے ہاکنگ کے لئے 'ٹاکنگ کمپیوٹر' ایجاد کیا۔ کمپیوٹر وہیل چیئر پر نصب کر دیا گیا، یہ کمپیوٹر ہاکنگ کی پلکوں کی زبان سمجھ لیتا تھا، اسٹیفن اپنے خیالات پلکوں سے کمپیوٹر پر منتقل کرتے۔ خاص زاویئے، توازن اور ردِم کے ساتھ ہلتی ڈلتی پلکیں کمپیوٹر کی اسکرین پر لفظ ٹائپ کرتی جاتیں اور ساتھ ساتھ اسپیکر پر یہ الفاظ نشر بھی ہوتے جاتے تھے۔ اسٹیفن ہاکنگ واحد انسان تھے جو اپنی پلکوں سے بولتے تھے اور پوری دنیا انہیں سنتی تھی۔

۱۴ر مارچ ۲۰۱۸ء کو اس عظیم سائنسداں کی

موت واقع ہوگئی جسے مرتے دم تک نوبل کمیٹی نے انعام کے لئے منتخب نہیں کیا کیونکہ اسٹیفن ہاکنگ کی کوئی بھی تھیوری ثابت نہیں کی جاسکی۔ حالانکہ اسٹیفن ہاکنگ کی شہرت ومقبولیت کا سبب وہی نظریات رہے جنہیں پوری دنیا نے تسلیم کیا۔

اسے محض اتفاق کہا جائے گا کہ جس دن اسٹیفن ہاکنگ کی موت واقع ہوئی اس سے ایک دن پہلے لکھنؤ میں مولانا ابوالکلام آزاد یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر اسلم پرویز نے اس یونیورسٹی کے لکھنؤ کیمپس کی نئی عمارت کے افتتاح کے موقع پر منعقد سیمینار میں کہا کہ سائنسی علوم کے لئے اردو داں طبقہ کو دیوانہ وار کام کرنے کی ضرورت ہے۔ انہوں نے کہا کہ اردو زبان و ادب میں ابھی تک سائنس وتکنیک پر مبنی مواد بہت کم موجود ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ سائنس کو مستقل نظرانداز کیا جانا اردو ادب کے لئے کسی حد تک ضرر رساں ثابت ہوسکتا ہے۔

گزشتہ دس پندرہ برس کی بات نہ کی جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ گھر اور باہر کی زندگی پر روز بہ روز وجود پذیر ہورہے تکنیکی آلات کی گرفت مضبوط ہوتی جارہی ہے، اس سے پہلے تک مغرب سے آنے والی ہر نئی چیز کو یکسر رد کردینے کی روش عام تھی۔ حالانکہ ان تکنیکی آلات سے گھرے ہونے کے باوجود اندر اندر ہمارے یہاں ابھی بھی مغربی علوم کو قبول عام کی سند حاصل نہیں ہوئی ہے۔

عصمت چغتائی نے اپنی شاہکار ناول 'ٹیڑھی لکیر' میں اس ضمن میں لکھا تھا کہ ہمارے اندر نہ جانے وہ کون سی روش موجود ہے کہ ہم ہر نئی چیز کو پہلے رجیکٹ کر دیتے ہیں اور بعد میں مجبوراً پھر اسے قبول بھی کر لیتے ہیں۔ اردو ادب کی ڈھائی تین سو سالہ تاریخ میں سائنس سب سے کم توجہ کی چیز رہی حالانکہ ڈھائی تین سو سال کا یہی وہ دور تھا جب سب سے زیادہ سائنسی ایجادات وتخلیقات ظہور پذیر ہوئیں حتیٰ کہ زندگی ان آلات کی گرفت میں آگئی۔

ایک مکتب فکر کے لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ دنیا کے کسی بھی زبان کا ادب ایک مخصوص زاویۂ نگاہ، طرز وفکر اور جہت پر ہی مرکوز ہوتا ہے۔ لیکن امریکن، یوروپین، اسکیوینڈینین، افریقی، چینی اور بالخصوص روسی ادب میں سائنسی علوم سے متعلق مواد خاطر خواہ تعداد میں موجود ہے۔ 'سائنس فکشن' کی اصطلاح بہت پہلے ہی وضع ہوچکی تھی، انگریزی میں ایک دو نہیں، اس پر درجنوں سیریز مل جائیں گی۔ سیکڑوں نہیں، ہزاروں انگریزی فلمیں سائنس فکشن پر بن کر مقبول ہوچکی ہیں اور اب دوسری زبانوں میں رکارڈ ہوکر ہندوستان میں بھی ذوق وشوق سے دیکھی جارہی ہیں۔ ہندوستان کی بات کریں تو بنگلہ، ہندی، مراٹھی اور تمل اور تیلگو میں بھی سائنسی علوم سے متعلق ادب نسبتاً کم لیکن مناسب مقدار میں موجود ہے۔

نیادور ریختہ پر

'نیادور' کے گزشتہ برس کے شمارے
rekhta.org پر اپلوڈ کردئے گئے ہیں۔

نیادور کا یہ شمارہ دنیا کی دو عظیم شخصیتوں، اسٹیفن ہاکنگ اور گارسیا گابرئیل مارکیز کے نام معنون ہے اور مارکیز کی چوتھی برسی پر انہیں خراج عقیدت بھی۔ سائنس میں جو مرتبہ اسٹیفن ہاکنگ کو حاصل تھا، تقریباً وہی مقام ادب میں گارسیا گابرئیل مارکیز کو حاصل رہا۔ ان کے شاہکار ناول 'تنہائی کے سو سال' پر ۱۹۷۰ء میں تبصرہ کرتے ہوئے 'ولیم کنیڈی' نے نیشنل آبزرور میں لکھا تھا کہ Book of Genesis کے بعد یہ پہلا ادبی شاہکار ہے جسے تمام نسل انسانی کو پڑھنا چاہئے۔

ہمیں امید ہے کہ 'نیادور' کا یہ شمارہ بھی گزشتہ شماروں کی طرح زبردست پذیرائی حاصل کرے گا اور مارکیز کے فن اور شخصیت کے بارے میں جو مواد پیش کیا جارہا ہے اس پر سیر حاصل گفتگو ہوگی۔ ہم مغربی ادب کے رمز شناس اور مشہور ناول نگار خالد جاوید کے شکرگزار ہیں کہ انہوں نے 'نیادور' کے لئے مارکیز پر قابل قدر مواد فراہم کیا۔ مشہور ہندی ادیب پربھارت رنجن کا بھی شکریہ جن کے توسط سے مارکیز کے بارے میں بیش قیمتی معلومات حاصل ہوئیں جنہیں ہم اس شمارے میں پیش کررہے ہیں۔ 'تنہائی کے سو سال' کے اقتباس کا ترجمہ ہندی سے اردو میں نیادور کے سابق مدیر نجیب انصاری نے کیا ہے، ان کا بھی شکریہ۔

اس شمارے میں مارکیز کی مختلف تصانیف کا تعارف بھی پیش کیا گیا ہے تاکہ مارکیز کی مجموعی ادبی شخصیت سے 'نیادور' کے قارئین روشناس ہوسکیں۔ ابھی تک ہم تخلیق پہلے شائع کرتے تھے اور تنقید اس کے بعد لیکن اس شمارے میں مارکیز کے ناول 'تنہائی کے سو سال' کے اقتباس کا ترجمہ اس لئے بعد میں شائع کر رہے ہیں کہ مارکیز کے فن اور ان کے مذکورہ ناول کے حال و احوال سے واقفیت کے بعد جب ناول کے اقتباسات کو پڑھا جائے گا تب زیادہ لطف آئے گا۔ اسی کے ساتھ میں ہم اپنے عہد کے کچھ اہم افسانہ نگاروں کے افسانے بھی اس شمارے میں شائع کررہے ہیں۔ یہ پورا شمارہ ایک طرح سے مارکیز اور عصری اردو فکشن پر مرکوز کیا گیا ہے۔

ہماری کوشش جاری رہے گی کہ نیادور کو ہم ہر اس جگہ، اس مقام اور اس خطے تک پہنچائیں جہاں جہاں اردو موجود ہے۔ نیادور کے سرورق کے اندرونی حصہ پر مشاہیر ادیبوں اور شاعروں کی تاریخ ولادت و وفات سے متعلق شائع جدول قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے کلینڈر سے ماخوذ ہے لہٰذا تاریخی اغلاط کے لئے 'نیادور' کسی طرح کا ذمہ دار نہیں ہے۔

'نیادور' کے مئی ۲۰۱۷ء تا حال تمام شمارے information.up.nic.in پر ملاحظہ کئے جاسکتے ہیں۔

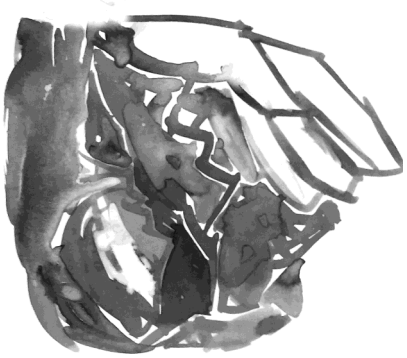

جادو بھری مشکلوں سے بھرا تھا گابرئیل گارسیا مارکیز کا بچپن

پربھات رنجن

ہندی کے معروف ادیب و نقاد
متعدد کتابوں کے مصنف
کئی اعزازات سے سرفراز،
'جانکی پل' کے روح رواں
بنیادی طور پر ناول نگار
فی الحال ذاکر حسین کالج، دہلی میں
پروفیسر کے عہدے پر فائز
وطن سیتامڑھی (بہار)

ذاکر حسین کالج،
جواہر لال نہرو مارگ، دہلی
رابطہ: 9891363062

ادب چاہے جیسا بھی ہو، چاہے جس قلمکار کا تخلیق کردہ ہو، اکثر ہمارا تجسس اس بات کو لے کر ہوتا ہے کہ آخر اس کی تحریک کا منبع کیا ہے۔ گابرئیل گارسیا مارکیز کے ناولوں کو پڑھتے ہوئے اکثر یہ اشتیاق پیدا ہوتا ہے کہ آخر ان کے ادب کی پراسرار تقریباً ناقابل یقین سی دکھائی دینے والی اس دنیا کی کوئی حقیقت بھی ہے یا سب کچھ محض خیالی ہے۔ مارکیز نے اپنے کئی انٹرویو میں یہ بات کہی ہے کہ درحقیقت ناقدین ان کی نگارشات کے جس اسلوب کو جادوئی حقیقت نگاری کہتے ہیں اس کی تحریک ان کے بچپن کے ان تجربات سے ملی جو ان کو 'اراکاٹک' میں اپنے نانا کے گھر میں قیام کے دوران ہوئے۔ اپنے بارے میں انہوں نے لکھا ہے کہ میری ابتدائی زندگی مشکل لیکن جادوئی تھی اور بعد کی زندگی عوامی اور پراسرار۔ درحقیقت اسی مشکل لیکن جادوئی ابتدائی زندگی میں مارکیز کی اس تخلیق کے راز چھپے ہوئے ہیں جس نے ان کی عوامی زندگی کو شاندار بنایا اور پراسرار بھی۔

مارکیز نے اپنی خودنوشت (Living to tell the tale) کا آغاز ۱۹۵۰ء کے ایک واقعہ سے کیا ہے جب ایک دن ان کی ماں ان سے ملنے آئی تھیں۔ وہ ان دنوں کولمبیا کے ایک چھوٹے سے قصبے کارتاجینا میں 'ایل ہیرالدو' نامی اخبار میں باقاعدہ طور پر لکھتے تھے اور اس سے جو تھوڑے بہت پیسے ملتے تھے اس سے اپنی زندگی چلاتے تے۔ ماں آئیں اور ان سے کہنے لگیں کہ اراکاٹک چلنا ہے۔ نانا کرنل نکولس کے گھر جو اُن کے انتقال کے بعد سے ویران پڑا تھا۔ اس گھر کو فروخت کرنے کے لئے وہ وہاں جانا چاہتی تھیں جس میں مارکیز کی پیدائش ہوئی اور بچپن گزرا۔ آٹھ نو سال کی عمر میں انہوں نے اراکاٹک کو الوداع کہا تھا اور اس کے بعد وہاں جانا نہیں ہو سکا تھا۔ انہوں نے اس سفر کے دوران دیکھا کہ وہاں کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔ صرف ان دنوں کی طرح وہاں چہل پہل نہیں تھی۔ سارا قصبہ اجڑ چکا تھا اور لوگ بھی لٹے پٹے سے بچے رہ گئے تھے جیسے پرانے دنوں کی یاد میں گم صم کھڑے ہوں۔ میرؔ کے لفظوں میں

'جیسے تصویر لگا دے کوئی دیوار کے ساتھ'

سفر کے دوران ان کو اپنے بچپن کی باتیں یاد آتی رہیں جیسے کوئی اپنی زندگی فلیش بیک میں دیکھ رہا ہو۔ کس طرح ان دنوں اراکاٹک کیلے کے باغات سے گلزار تھا۔ کس طرح اپنے نانا کرنل نکولس ریکارڈو مارکیز

کے ساتھ وہ وہاں کی گلیوں محلوں میں گھوما کرتے تھے، کس طرح کیلے کی تجارت کرنے والی یونائیٹڈ فروٹ کمپنی نے وہاں سے اپنی تجارت سمیٹ لی اور دھیرے دھیرے قصبے کی رونق جانے لگی۔ اراکاٹک کی ویران گلیوں میں اپنی ماں کے ساتھ گھومتے گھومتے ان کو ساری باتیں یاد آتی رہیں۔ وہ سفر ان کا یادگار سفر بھی ثابت ہوا۔ ان کو اپنی زندگی کا وہ دور یاد آ گیا جس کو بھولے، زمانہ گزر گیا تھا۔ بہادری کی داستانوں کی دنیا، بھوت پریت میں یقین کرنے کے ان کے بے شمار قصے، کثیر قومی کمپنی کی خوشحالی میں پھلتے پھولتے لوگ، محبت اور نفرت کے درمیان بنتے مٹتے قصے۔

اس سفر کے بارے میں انہوں نے خود لکھا ہے کہ جب میں نے اپنے بچپن کے اس گھر کو دیکھا جسے آٹھ سال کی عمر کے بعد میں اب تئیس سال کی عمر میں دیکھ رہا تھا تو میں نے محسوس کیا کہ وہ درحقیقت سچائی اور یاد وطن کا ایک ملغوبا ہے جو بعد میں لکھی گئی میری تخلیقات کا خام مواد بنا۔ انہوں نے لکھا ہے کہ اس سفر سے واپس آتے ہوئے وہ اپنی ماں کے ساتھ ہی نہیں لوٹ رہے تھے بلکہ ان کے ساتھ اراکاٹک کے وہ تمام لوگ بھی تھے جن سے وہ بچپن کے بعد سے نہیں ملے تھے اور ان میں سے زیادہ تر تب تک تو اس دنیا کو چھوڑ کر بھی جا چکے تھے۔ یہ وہ اراکاٹک تھا جو صرف ان کی یادوں میں بچا ہوا تھا۔ ایک ایسا گھر تھا جو اس وقت تو بدحال اور اجاڑ دیکھائی دے رہا تھا اور بڑی حد تک آسیب زدہ بھی۔ ایک وقت ایسا بھی تھا جب اس کی رونقوں میں شہر بھر کی رونقیں چھپی تھیں۔

اس سفر سے واپس آنے کے بعد ان کے دماغ میں 'لیف اسٹارم' (پتوں کی آندھی) ناول کا آئیڈیا آیا جس کا آغاز اس سطر سے ہوتا تھا:

'میں تم سے یہ کہنے آئی ہوں کہ پلیز میرے ساتھ اس گھر کو بیچنے چلو۔'

جوان کی ماں نے سفر پر جانے سے پہلے کہے تھے۔ یہ ناول تو پوری طرح ان دنوں کی یادوں پر منحصر تھا۔ یہی نہیں ان کی متعدد تخلیقات میں، افسانوں اور ناولوں میں اراکاٹک کی کہانیاں اتنی بار آئی ہیں کہ کولمبیا کے اس گمنام قصبے کی تحریروں نے عالمی شہر بنا دیا، لیٹن امریکی ممالک کے متعدد اہم شہروں کی طرح اسے بھی ایک جانے پہچانے شہر میں بدل دیا۔ لوگ اس افسانوی شہر کی حقیقتوں سے روبرو ہونا چاہتے ہیں۔ ان کی تحریروں کے سبب کولمبیا جانے والے سیاح اس شہر کے سفر پر بھی جانے کی تمنا رکھتے ہیں جو مارکیز کی تخلیقات کا پس منظر رہا ہے اور جہاں اس قلمکار نے اپنی زندگی کے ابتدائی آٹھ نو سال اپنے ماں باپ نہیں بلکہ اپنے نانی کے ساتھ رہتے ہوئے وہاں آزادانہ ماحول میں گزارے تھے۔

اراکاٹک میں کرنل نکولس کے اسی گھر میں ۶/مارچ ۱۹۲۷ کو ان کی لڑکی لوئیسا سانتیاگا مارکیز کی پہلی اولاد کی شکل میں اس لڑکے کی پیدائش ہوئی جو بعد میں اپنے بے مثال طرز تحریر کے سبب پورے لیٹن امریکی باشندوں کو اتنا اپنا اپنا لگنے لگا کہ آج بھی ان ممالک کے لوگ ان کا ذکر آنے پر ان کو گابو کہہ کر کچھ اس طرح بلاتے ہیں جیسے وہ ان کے اپنے ہی گھر کا کوئی نوجوان ہو یا پڑوس کا کوئی بزرگ۔ اس کی بے پناہ شہرت کا سبب وہی قصبہ ہے جس کی بیسویں صدی کے آغاز سے قبل نقشے میں کوئی جگہ بھی نہیں تھی۔ وہ ایک مختصر سا دور تھا جب اراکاٹک کے چھوٹے سے ریلوے اسٹیشن پر بڑے بڑے لوگ اترا کرتے تھے۔

دراصل بیسویں صدی کے شروع میں ۱۹۰۵ء وہاں بوسٹن کی ایک امریکی یونائیٹڈ فروٹ کمپنی کیلے کے باغات لگانے کا فیصلہ کیا۔ کیلے سے بنے چپس اور دیگر اشیائے خوردنی کی شمالی اور جنوبی امریکہ میں بہت مانگ اور کھپت تھی۔ وہاں کام بڑھنے لگا اور روزگار کی تلاش میں وہاں کئی کبریائی ممالک کے لوگ آ کر آباد ہونے لگے۔ انہیں دنوں مارکیز کے نانا بھی کسی اور سبب سے یہاں آ کر آباد ہو گئے اور پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ اراکاٹک کولمبیا کے تیزی سے ابھرتے ہوئے شہر کے طور پر پہچانا جانے لگا۔ ان دنوں کیلے کی اس کمپنی کی پیلی رنگت والی ریل گاڑی کو اس علاقے میں امیدوں کی ریل گاڑی کے طور پر دیکھا جانے لگا تھا جس میں بیٹھ کر دور دور سے لوگ یہاں پسینہ بہانے اس امید میں آتے کہ اس شہر کی طرح ایک دن ان کی قسمت کا ستارا بھی چمکے گا۔ اراکاٹک ان دنوں سپنوں کا شہر بن گیا تھا۔

کیلے کی کھیتی کی توسیع کے سبب اراکاٹک کی آبادی بڑھنے لگی۔ ۱۹۰۰ء میں وہاں محض چند سو لوگ رہتے تھے جو ۱۹۱۳ء تک بڑھ کر تین ہزار ہو گئے اور ۱۹۲۰ء کے دہے تک آبادی بڑھ کر دس ہزار تک ہو گئی تھی۔ کولمبیا کے اس سارے علاقے میں وہ سب سے گرم اور امس والا علاقہ تھا جو اچھے کیلے کی کھیتی کے لئے سب سے مفید مانا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے وہاں کے کیلے کافی بڑے ہوتے تھے اور ان کی مانگ بھی سب سے زیادہ ہوتی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اراکاٹک کے سب سے سنہرے دنوں میں دنیا کی ہر چیز وہاں ملتی تھی۔ صرف دنیا بھر کی مصنوعات ہی نہیں، رقص کے لئے خوبصورت ساتھی سے لے کر الیکشن کے ووٹ تک۔ امریکی کمپنی کی آمد نے اس چھوٹے سے قصبے کو ایک بڑے بازار میں بدل دیا تھا۔ ایک ایسا بازار جو سپنے جگاتا بھی تھا اور ان کو پورا بھی کرتا تھا۔

آبادی میں اس قدر اضافے کے باوجود اراکاٹک بمشکل دس محلوں کا ایک چھوٹا سا شہر ہی بنا رہا۔ اگر امس بھری گرمی کو برداشت کرنے کی قوت رکھتا ہو تو کوئی عام آدمی محض بیس منٹ میں اس کا ایک سرے سے دوسرا سرا ناپ سکتا تھا۔ یونائیٹڈ فروٹ کمپنی کا آفس کرنل نکولس مارکیز کے گھر کے عین سامنے تھا۔ ریلوے لائن کے دوسری طرف امریکی کمپنی کے افسروں کے گھر تھے۔ اس کے قریب ہی ایک کلب تھا جس میں ٹینس

کھیلنے کا کورٹ بنا تھا اور ایک سوئمنگ پول بھی تھا جہاں ململ کے کپڑے پہنے خوبصورت عورتیں چھتریوں کی طرح ٹوپی پہنے سنہری قینچیوں سے اپنے باغیچے کے پھولوں کی کٹائی کرتی دکھائی دیتی تھیں۔ سب کچھ حسین خواب جیسا لگتا تھا۔

جیسے کوئی حسین خواب درمیان میں ہی ٹوٹ جاتا ہے۔ اراکاٹک کی خوشحالی کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ ۱۹۲۸ء میں مارکیز کی پیدائش کے ایک سال کے اندر ایک ایسا سانحہ ہوا جس کی خوفناک یادیں آہستہ آہستہ ماضی کی خوشگوار یادوں پر بھاری پڑنے لگیں۔ بات یہ تھی کہ یونائیٹڈ فروٹ کمپنی کو بڑے پیمانے پر مزدوروں کی ضرورت رہتی تھی۔ ریلوے لائن کی تعمیر کے لئے، آبپاشی کے لئے، نہریں بنانے کے لئے، کھیتوں کو تیار کرنے کے لئے، درخت لگانے کے لئے اور پھلوں کی کٹائی کے لئے۔ شروع شروع میں تو انہوں نے مزدوروں کو اپنی ضرورتوں کے مطابق استعمال کیا اور اپنا کام بخوبی چلتے رہے لیکن جیسے جیسے بیداری آتی گئی مزدوروں کی یونینیں بننے لگیں، ان کے مطالبات سامنے آنے لگے۔ نومبر ۱۹۲۸ء میں انہوں نے بڑے پیمانے پر اپنے اتحاد کا ثبوت دیتے ہوئے اور زیادہ اجرت اور کام کے بہتر حالات کا مطالبہ کیا۔ انتظامیہ نے ان کو کب توجہ دی تھی جو اس مرتبہ دیتے۔ ان کے مطالبات ٹھکرا دئے گئے۔

نتیجہ ہڑتال کی شکل میں سامنے آیا۔ کیلے کے باغات کے تیس ہزار ملازمین نے ہڑتال کر کے اپنے اتحاد کا مظاہرہ کیا۔ اسی دن انہوں نے کیلے کے سارے باغات پر قبضہ بھی کر لیا۔ اس امریکی کثیر قومی کمپنی کے سامنے اچانک بہت بڑی مصیبت آ گئی۔ کولمبیا کی حکومت ایسے وقت میں یونائیٹڈ فروٹ کمپنی کی مدد کو سامنے آئی۔ معاملہ ختم کرنے کے لئے اگلے دن تقریباً دو ہزار فوجی علاقہ کی طرف بھیجے۔ کہتے ہیں کہ کمپنی کے مالکوں نے فوجی افسروں کا آگے بڑھ کر خیر مقدم کیا۔ فوجیوں کو کمپنی کے احاطے میں ٹھہرایا گیا۔ کہتے ہیں کہ کمپنی والوں نے صاحبوں کے لئے شاندار دعوتوں کا اہتمام کیا جس میں مقامی عورتوں کی عزت اتاری گئی۔ طوائفوں کو برہنہ کر کے فوجی گھوڑوں پر بٹھایا گیا اور کمپنی کے گندے نالوں میں ان سے برہنہ ہو کر غسل کرایا گیا۔ اس سے لوگوں کا غصہ بڑھتا گیا۔

دسمبر ۱۹۲۸ء کی ایک صبح تقریباً تین ہزار مزدور وہاں کے خاص خاص علاقوں اور ریلوے پر قبضے کے ارادے سے آگے بڑھے تا کہ اس علاقہ کی آمد و رفت اور مواصلاتی نظام کو اپنے قبضے کیا جا سکے۔ مزدوروں کو مقامی لوگوں کی پوری حمایت حاصل تھی۔ کہتے ہیں کہ کمپنی کے اشارے پر فوجیوں نے ان گستاخ مزدوروں کو سبق سکھانے کا فیصلہ کیا۔ اتنی بڑی تعداد میں مزدور ان ٹھکانوں کی طرف بڑھ رہے تھے کہ ان کے سامنے فوجیوں کی تعداد کم پڑ رہی تھی۔ فوج کے افسروں نے اپنے فوجیوں کو گولی چلانے کا حکم دے دیا۔ بعد میں کسی چشم دید گواہ نے بتایا کہ تقریباً پانچ منٹ تک سیکڑوں فوجی گولی چلاتے رہے۔ پانچ منٹ بعد جب گولی باری تھمی تو سامنے بڑی تعداد میں چیختے کراہتے لوگ پڑے ہوئے تھے۔ ان کے بعد ان دن کے بارے میں طرح طرح کے قصے اسی طرح لوگوں کی یادوں میں محفوظ رہ گئے جس طرح اپنے ملک میں جلیانوالہ باغ کا سانحہ۔ یقینی طور پر کتنے لوگ اس دن وہاں مارے گئے اس کے بارے میں وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ سانحہ کے تقریباً چالیس سال بعد مارکیز نے اپنے ناول 'تنہائی کے سو سال' میں لکھا کہ اس دن تقریباً تین ہزار لوگ مارے گئے تھے۔ بیشتر لوگ اس افسانوی سچ میں ہی یقین کرتے ہیں۔

امریکی کمپنی اور فوج کا ظلم یہیں نہیں تھما۔ تقریباً تین مہینے تک شہر کو ایک طرح سے انہوں نے یرغمال بنائے رکھا۔ نہ جانے کتنے مزدور گرفتار کر لئے گئے۔ کہا جاتا ہے کہ فوجیوں نے ان کو بھی قتل کر کے رات کے اندھیرے میں چپ چاپ دفن کر دیا۔ ان کے بارے میں کبھی بھی کچھ بھی پتہ نہیں چل سکا۔ انہوں نے شہر کے افسروں پر اس کے لئے دباؤ بنایا کہ وہ حکومت کو اپنی رپورٹ بھیجیں جس میں یہ لکھیں کہ وہاں فوج عوام کی بھلائی کے کام میں لگی ہے۔ عوام ان کے کاموں سے بہت خوش ہیں۔ تین مہینے کے بعد جب فوج وہاں سے گئی تو اراکاٹک کا بہت کچھ ایسا تباہ کر گئی جو پھر کبھی واپس نہیں آیا۔ نہ وہ رونقیں واپس آئیں نہ وہ خوشحالی۔ بربادی کا ایک اجاڑ منظر رہ گیا۔ کچھ دنوں کے بعد وہاں سے امریکی کمپنی نے بھی اپنا کام سمیٹنا شروع کر دیا۔ اس کا اثر فوری طور پر تو نہیں پڑا لیکن آنے والے برسوں میں اراکاٹک پوری طرح ویران ہو گیا۔ بہرحال اسی کشمکش کے دور میں مارکیز کی وہاں پیدائش ہوئی۔ گابرئیل کی پیدائش کے ساتھ وہاں کے لوگوں کی کچھ اور یادیں بھی وابستہ ہیں۔

مارکیز کی یادوں میں صرف اراکاٹک شہر کا عروج و زوال ہی نہیں تھا، اس کا وہ وسیع مکان اور اس میں جاندار چمک بھی تھی۔ مارکیز کو وہ گھر اکثر یاد آتا تھا جس کے عقب کے باغیچے میں امس بھری راتوں میں چنبیلی کی بھینی بھینی خوشبو بھری رہتی تھی اور جس کے بے شمار کمروں میں کب کے مر چکے رشتہ داروں کے گانے کی آوازیں آیا کرتی تھیں۔ جب گھر کے اوپر رات اترتی۔ للّی اور چنبیلی کی بھرپور خوشبو اور جھینگروں کی آواز سے گاڑھی ہو چکی رات۔ پانچ سال کے گابرئیل کی نانی اسے کرسی پر خود سے چپکائے رکھتیں، گھر بھر میں ٹہل رہے متوفیوں کی کہانیاں سنا کر۔ مارکیز کو ڈر تو لگتا لیکن ان کو ان پراسرار راتوں سے پیار بھی ہو گیا تھا۔

نانا اس گھر کے اور شاید شہر کے بھی ہیرو تھے۔ مارکیز کے لئے عظیم ہیرو تھے۔ ان کی دنیا گھر کے باہر تھی جس میں گزرے ہوئے زمانے کی بہادری کے قصے تھے اور انعام کا انتظار تھا، مسلسل اور طویل

انتظار۔ ۱۹۶۷ء میں 'تنہائی کے سو سال' کی اشاعت اور اس کی غیر متوقع کامیابی کے بعد اسپینش زبان کے ایک دیگر ناول نگار ماریو ورگاس لیوسا نے ان سے بات چیت کے دوران پوچھا تھا کہ ان کے بچپن کو متاثر کرنے والا سب سے اہم شخص کون تھا، وہ شخص کون تھا جس کی ان سے اب بھی یاد آتی ہو تو مارکیز نے جواب دیا، میرے نانا۔

اپنے ایک دیگر انٹرویو میں انہوں نے اپنے نانا جی کے بارے میں کہا ہے کہ نانی کی الجھن بھری خوفناک دنیا کے برعکس نانا جی کا وجود میرے لئے مکمل سلامتی کی علامت تھا۔ سنہرے فریم کا چشمہ لگانے والے اس طویل قامت لیکن مضبوط قد کاٹھی والے انسان کی شخصیت ایسی تھی کہ برسوں بعد جب مارکیز کے ناول 'لَو ان دی ٹائم آف کالرا' پر فلم بنی تو اس کے ہیرو کو بھی ڈائرکٹر نے وہی گیٹ اپ دیا جو مارکیز اکثر اپنے نانا کا بتاتے رہے ہیں۔ وہ مصنوعی آواز میں ایسے بولتے تھے جیسے کسی جلسۂ عام میں بول رہے ہوں، تقریر کر رہے ہوں کسی بڑے لیڈر کی طرح۔

نانی کے بھوت پریتوں کا خوف نانا کی صحبت میں آکر ختم ہو جاتا تھا۔ ان کے ساتھ ہونے پر میرے سارے وسوسے دور ہو جاتے تھے۔ اپنے اندر ہمت کی ترسیل ہوتی تھی۔ مجھے پھر سے یہ یقین ہوتا تھا کہ میں حقیقت کی ٹھوس سطح پر کھڑا ہوں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ میں اپنے نانا کی طرح کا بننا چاہتا تھا۔ حقیقت پسند، بہادر اور بے خوف لیکن نانی کی پراسرار دنیا کی مقناطیسیت مجھے ان کی طرف بھی لے جاتی تھی، ان کے ماورائی قصوں کی کشش ہی کچھ ایسی تھی۔

مارکیز نے اپنی خودنوشت سوانح عمری میں لکھا ہے کہ ان کا جادوئی حقیقت پسندی کا جو اسلوب ہے اس میں حقیقت اور تخیل کی ہی کشمکش دکھائی دیتی ہے۔ ایسی حقیقت پسندی جس سے روایتی اعتبار کو الگ نہیں سمجھا جاتا۔ وہ ان کے نانا نانی کے دو مختلف جہانوں کے تصورات کی طرح ہیں۔ یہ کشمکش الگ الگ شکلوں میں ان کی مختلف تخلیقات میں دکھائی دیتی ہے۔ دلیلوں کے اعتبار کی یہی کشمکش ان کی تخلیقات کی روح ہے اور ان کے طرز تحریر کی سب سے بڑی خصوصیت بھی۔

ان کی زندگی اور ان کی تخلیقات میں بھی نانا کی موجودگی ایک دیومالائی انسان کی طرح ہے یا اس بہادر انسان کی طرح جسے شہر میں سب لوگ فخر اور احترام کے ساتھ دیکھتے تھے، سب جس کی بہادری اور مردانگی کا چرچا کیا کرتے تھے۔ جب مارکیز ان کی انگلی پکڑ کر شہر میں نکلتے اور شہر کے لوگ ہزار دنوں کی جنگ کے ہیرو کو سلام کرتے تو مارکیز اپنے آپ کو بھی اہم سمجھنے لگتے تھے۔ کرنل نکولس مارکیز نے کولمبیا کی تاریخ کی سب سے خونریز جنگوں میں شامل ایک ہزار دنوں کی جنگ میں حصہ لیا تھا۔ حالانکہ جن وسیع القلب لوگوں کی طرف سے انہوں نے جنگ میں حصہ لیا تھا وہ شکست سے دوچار ہوئے تھے لیکن اس جنگ کے دوران نکولس نے جو بہادری دکھائی تھی اس سے اس ساحلی علاقہ میں کئی قصے مشہور ہوئے۔

ایک قصے کے مطابق جب ان کے نانا نوجوان تھے تو ایک آدمی ان کو بہت پریشان کرتا تھا۔ بار بار ان کو آمنے سامنے لڑنے کا چیلنج دیتا تھا۔ نکولس مارکیز نے کافی دنوں تک اس آدمی کی حرکتوں کو نظر انداز کیا لیکن جب پانی سر سے اونچا ہو گیا تو ایک دن انہوں نے اس کا چیلنج قبول کر لیا۔ انہوں نے اس سے کشتی کا دن اور وقت طے کیا۔ مقررہ وقت پر انہوں نے اس آدمی کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ شہر میں سب اس واقعہ کو جانتے تھے اور وہ نکولس کے ساتھ تھے۔ اس میں ان کو جیل بھی جانا پڑا، وہاں چند سال گزارنے کے بعد ان کو وہ شہر چھوڑنا پڑا۔ کہتے ہیں کہ اس کے بعد انہوں نے اپنے رہنے کے لئے نیا شہر بسایا۔ اراکاٹک اسی شہر کا نام تھا۔ بہت بعد میں اس ڈرامائی واقعہ کو مارکیز نے اپنے مشہور ناول 'تنہائی کے سو سال' کا حصہ بنایا۔

ان کے نانا کی دنیا کافی الگ تھی۔ وہ ہمیشہ جوش میں رہتے تھے۔ محرومیوں کی شکن بھی کبھی اپنے چہرے پر نہیں آنے دیتے تھے یہاں تک کہ اپنے آخری دنوں میں بھی عمر کے حساب سے بوڑھے نہیں لگتے تھے۔ ایک دن جب وہ پیڑ سے اپنے بوڑھے اور نظر سے کمزور طوطے کو اتارنے کے لئے چڑھے تو تقریباً چار میٹر کی اونچائی سے گر گئے لیکن حیرت انگیز طور پر بچ گئے حالانکہ کچھ عرصہ بعد اسی چوٹ سے ان کی موت ہو گئی۔ یہ منظر مارکیز کی آنکھوں میں ایسا نقش ہو گیا کہ برسوں بعد جب انہوں نے 'لَو ان دا ٹائم آف کالرا' نامی اپنا مشہور ناول لکھا تو اس میں یہ منظر شامل کیا۔ فرق بس اتنا تھا کہ ان کے نانا گرنے کے بعد بچ گئے تھے لیکن گرنے سے ناول کے اس بوڑھے کی موت ہو جاتی ہے۔

جب ان سے دریافت کیا گیا تو انہوں نے کہا تھا کہ میرے ناول 'لیف اسٹارم' کے بے نام کرنل کا کردار واحد ایسا کردار ہے جس کے بارے میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ میرے نانا سے ملتا جلتا ہے۔

بعد میں ان کے نانا کی ایک آنکھ کی روشنی چلی گئی تھی۔ وہ سانحہ اپنے آپ میں اتنا ڈرامائی ہے کہ کسی ناول کا حصہ معلوم ہوتا ہے۔ ایک دن وہ اپنے دفتر کی کھڑکی سے ایک سفید گھوڑے کو دیکھ رہے تھے کہ ان کو ایسا محسوس ہوا جیسے ان کی بائیں آنکھ میں کچھ ہو رہا ہے۔ اپنا ہاتھ انہوں نے آنکھ پر رکھا اور بغیر کسی درد کے ان کی بائیں آنکھ کی روشنی چلی گئی۔ بعد میں ان کی نانی نے یہ کہانی سناتے ہوئے مارکیز سے کہا تھا، ان کے ہاتھ میں آنسوؤں کے علاوہ کچھ بھی نہیں بچا۔ بہت دنوں تک وہ اپنی روشنی سے محروم آنکھ پر سمندری لٹیروں کی طرح کالی پٹی باندھتے رہے۔ بعد میں ڈاکٹر نے اس پر چشمہ چڑھا دیا اور چلنے کے لئے ہاتھ میں چھڑی دے دی جو بعد میں ان کی پہچان کا حصہ بن گئی۔ بُشرٹ کی اوپری جیب میں سنہری چین والی گھڑی رہتی تھی جو عجیب سی موسیقی کے ساتھ کھلتی تھی۔

'لیف اسٹارم' میں یہ واقعہ کچھ بدلی ہوئی شکل میں آیا ہے۔ اس کا کرنل لنگڑا ہے اور اس کے لنگڑے پن کا تعلق جنگ سے ہے۔ دراصل ان کے نانا کو ہزار دنوں کی جنگ کے دوران گولی لگ گئی تھی جس کا پتہ تب چلا جب ان کے انتقال سے کچھ دن پہلے وہ گر گئے تھے اور ایک ڈاکٹر ان کی جانچ کر رہا تھا۔ اس جانکاری نے مارکیز کو مسحور کر دیا تھا۔ اپنے نانا کی بہادری کے بارے میں اس دن ان کو محسوس ہوا کہ وہ محض کہانیاں نہیں تھیں، ان میں کچھ سچائی بھی تھی۔ 'تنہائی کے سو سال' کے کرنل آرلیانو بوئن دیا سے بھی ان کے نانا کے کردار کو جوڑ کر دیکھا جاسکتا ہے۔ یہی نہیں، 'لو ان دا ٹائم آف کالرا' میں جس طرح سے بوڑھے کرداروں کو پیش کیا گیا ہے وہ اپنے آپ میں کہیں نہ کہیں نانا کے اسی عکس کی دین ہیں۔ یہ نانا کا ہی اثر کہا جاسکتا ہے کہ بوڑھے کرداروں کے تئیں ان کی تحریروں میں کشش بنی رہی۔ بڑھاپے کی تصویر کشی ان کے یہاں بڑے اپنے پن سے ہوئی ہے۔

نانا جی اپنے دوستوں کے ساتھ شام کو شہر کے ایک کیفے میں ملا کرتے تھے۔ (یہ کیفے 'تنہائی کے سو سال' کے کیفے کا ماڈل بنا) وہ سب انہیں کی طرح بوڑھے اور وسیع القلب تھے جنہوں نے جنگ کے شور اور بارود کی بُو کے درمیان فوجی اعزازات حاصل کئے تھے۔ کیفے میں اوپر پنکھے چلتے رہتے تھے اور نیچے ان کپتانوں، کرنلوں اور جنرلوں کی گفتگو جو جنگ کی یادوں کے ارد گرد گھوما کرتی، جیسے تب سے کچھ بھی نہ ہوا ہو۔ وقت وہیں کا وہیں ٹھہرا ہوا ہو۔ درحقیقت ان کی محرومی سے پُر زندگی کی وہی خوش آئند یادیں تھیں جن کو وہ یاد کرتے اور کچھ دیر کے لئے ہی سہی محرومیوں سے پُر حالات سے دور چلے جاتے۔ اراکاٹک کی اُمس بھری شدید گرمی میں وہ یادیں ہی ان کو ٹھنڈک پہنچاتی تھیں۔ ان یادوں نے ان کی افسانوی دنیا کے متعدد کرداروں کی تخلیق کی۔ اسی ٹھہری ہوئی زندگی نے بعد میں ان کے ناولوں میں رفتار پکڑی۔ اس نے ایک ایسے ماحول کی تخلیق کی جو اپنے آپ میں پُراسرار لگنے لگا۔ درحقیقت نانا کے ساتھ کے تجربات نے بعد میں تخلیق کار مارکیز کی بڑی مدد کی۔

مارکیز نے بعد میں اپنی خودنوشت سوانح حیات میں لکھا ہے کہ جب دن کے وقت نانا کی انگلی پکڑ کر وہ اس کثیر قومی کمپنی کے بازار میں شاپنگ کرنے جاتے تو دراصل وہ دو الگ الگ جہانوں میں چل رہے ہوتے تھے۔ مارکیز نے آگے لکھا ہے کہ نانا کی اپنی وسیع دنیا تھی تو میری چھوٹی سی اپنی الگ دنیا تھی جس میں خواب تھے، حسرتیں تھیں۔ وہ سڑکوں پر چلتے چلتے لوگوں سے سیاست کی، سماج کی باتیں کیا کرتے تھے جب کہ میں اپنے لئے کھانے پینے کی کسی چیز پر نظریں جمائے رہتا۔ وہ نیچے سے اپنی اپنی بالکنی میں کھڑے لوگوں سے ہاتھ ہلا ہلا کر علیک سلیک کیا کرتے تھے جب کہ میں دکان میں سجا کر رکھے گئے کسی کھلونے کو للچائی نظروں سے دیکھتا رہتا تھا۔ وہ اپنی بڑی عوامی دنیا میں ٹہلتے، میں اپنی نجی دنیا میں چلتا رہا، ان کی اس عوامی دنیا سے بچتا بچاتا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ مارکیز کے یہ مشہور نانا کوئی خاص پڑھے لکھے نہیں تھے۔ مارکیز نے خود لکھا ہے کہ انہوں نے کبھی اس سمت میں سنجیدگی سے کوئی کوشش بھی نہیں کی۔ ان کو ہائی اسکول کی پڑھائی اس لئے چھوڑنی پڑی کیونکہ ان کو کیریبیائی کنارے آکر خانہ جنگیوں میں حصہ لینا تھا۔ اس کے بعد ان کو کبھی بھی پڑھنے کا موقع نہیں ملا لیکن اپنی عمومی فراست سے وہ تعلیم سے اس دوری کو ختم کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ وہ اپنے پاس ایک انسائیکلوپیڈیا رکھتے تھے اور کسی بھی چیز کی فوری معلومات کے لئے اس کا استعمال کرتے۔ اس وجہ سے ان کی علمی معلومات کافی اچھی تھی۔ انہوں نے مارکیز کو بچپن سے ہی انسائیکلوپیڈیا اور لغت دیکھنے کی عادت ڈالی۔ اس انسائیکلوپیڈیا کے بارے میں انہوں نے مارکیز سے کہا تھا کہ یہ ایک ایسی کتاب ہے جو نہ صرف ہر چیز کے بارے میں جانتی ہے بلکہ یہی ایک ایسی کتاب ہے جو کبھی غلط نہیں ہوتی۔ مارکیز نے پرتجسس انداز میں نانا سے پوچھا تھا، اس میں کتنے الفاظ ہیں، سب کچھ جو اس دنیا میں ہے، نانا نے جواب دیا تھا۔ تحریری لفظوں کے جادو سے یہ ان کا پہلا انٹرویو تھا۔

نانا کی صحبت نے مارکیز کو آٹھ سال کی عمر میں باہری دنیا کی ایسی معلومات بہم پہنچائی جو تاعمر ان کے ساتھ رہی۔ کتابی دنیا میں داخل ہونے سے پہلے مارکیز کو نانا نے ہر اس چیز کی عملی معلومات فراہم کرانے کی کوشش کی تھی جس کے بارے میں جاننے کے لئے بچے متجسس رہتے ہیں۔ بعد میں مارکیز کی نصابی تعلیم کے لئے اس علم نے ٹھوس بنیاد کا کام کیا۔ وہ مارکیز کے لئے والد کی طرح تھے کیونکہ ان کو اپنے والد کے ساتھ رہنے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ انہوں نے ایک والد کی طرح ہی اپنے نواسے کو پالا۔ وہ کبھی اپنے والد کے اتنے قریب نہیں ہو پائے جتنا کہ اپنے نانا کے قریب تھے۔

پہلے پہل اپنے نواسے کو کرنل نے کہانیاں سنانا شروع کیا تھا۔ وہ قصے ہزار دنوں کی جنگ کے ہوتے تھے اور اپنے آئیڈیل لیٹن امریکی ممالک کے نجات دہندہ سیمون بولیوار کے۔ بولیوار سے وہ اتنا متاثر تھے کہ کھانے کی میز کے عقب میں انہوں نے ایک بڑی سی تصویر لگا رکھی تھی جس میں بولیوار کے آخری سفر کا منظر تھا۔ بچپن میں بولیوار کی بہادر کے قصے سناتے سناتے وہ اپنے نواسے کے قصوں سے متاثر ہو کر ایک دن مارکیز نے ان سے طفلانہ لہجے میں پوچھا۔ کیا بولیوار عیسیٰ مسیح سے بھی عظیم تھے؟ ایک چیز کا دوسری چیز سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ تقریباً لاجواب ہو گئے۔ نانا نے جواب دیا تھا۔ بہرحال بولیوار کے ان قصوں نے مارکیز کو کتنا متاثر کیا، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ بعد میں مارکیز نے بولیوار کو بنیاد بنا کر ایک مکمل ناول لکھا، 'جنرل اینڈ ہز لیبرنتھ'

نانا کو لے کر مارکیز کی سب سے زیادہ یادیں شہر کی گلیوں محلوں میں ٹہلنے کی ہیں اور نانا کے عجیب و غریب قسم کے دوستوں سے ملنے کی ہیں۔ ایسے ہی ایک کردار تھے ڈان ایمیلیو، جو بلجیم سے وہاں پہلی جنگ عظیم کے بعد کے دور میں آئے تھے۔ وہ لنگڑا کر چلتے تھے کیونکہ ان کے ایک پیر میں گولی لگی تھی۔ وہ زیورات بنانے کے کام میں ماہر سمجھے جاتے تھے۔ اکثر شام کے وقت وہ ان کے نانا کے ساتھ تاش یا شطرنج کھیلتے تھے۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہی چل رہا تھا کہ ایک دن وہ 'آل کوائٹ آن دا ویسٹرن فرنٹ' نامی فلم دیکھنے گئے۔ واپس گھر آئے اور سائنائڈ کھا کر خودکشی کر لی۔ اس آدمی کی شخصیت مارکیز کے اندر ہی اندر اتنی گہرائی تک بسی تھی کہ ان کے دو ناولوں 'لیف اسٹارم' اور 'لو ان داٹائم آف کالرا' میں وہ نمودار ہوا۔

نانا کے ساتھ اپنے بچپن کے رشتوں کو یاد کرتے ہوئے مارکیز نے اپنی ایک گفتگو میں کہا ہے کہ کرنل نکولس ریکاردو مارکیز یعنی میرے نانا ایک ایسے شخص تھے جن کے ساتھ شاید میری سب سے اچھی بنتی تھی اور جن کے ساتھ میری آپسی سمجھداری سب سے زیادہ تھی حالانکہ جب میں پیدا ہوا اس وقت ان کی عمر تقریباً ۶۳ سال ہو چکی تھی لیکن اب جب تقریباً پچاس سال اور مڑ کر دیکھتا ہوں تو لگتا ہے کہ انہوں نے شاید کبھی بھی اس بات کا احساس نہیں کرایا۔ میرے نانا کی موت تب ہو چکی تھی جب میں آٹھ سال کا تھا۔ ان کے انتقال کے وقت میں ارا کاٹک سے بہت دور تھا۔ مجھے تو یہ خبر بھی نہیں دی گئی۔ جب میں نے گھر کے لوگوں کو اس کے بارے میں بات کرتے سنا تب مجھے اس المیہ کا پتہ چلا۔ اب ایک بالغ کے طور پر جب بھی میرے ساتھ کچھ خاص رونما ہوتا ہے تو مجھے اپنی خوشی مکمل نہیں لگتی کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ میرے نانا اسے جان سکتے۔ مجھے اب بھی لگتا ہے کہ اگر وہ زندہ ہوتے تو میری کامیابیوں سے سب سے زیادہ خوشی انہیں کو ہوتی۔

ارا کاٹک کے اس گھر کے بارے میں مارکیز نے اپنی خودنوشت سوانح عمری میں لکھا ہے کہ وہ گھر کم لگتا تھا بلکہ اپنے آپ میں ایک شہر کی طرح لگتا تھا۔ مہمان خانے میں میز کے پاس ہمیشہ کوئی نہ کوئی بیٹھا رہتا تھا۔ مارکیز نے لکھا ہے کہ تین سال کی عمر کے بعد کی ان کی یادوں میں یہ بھی ہے کہ اس کمرے میں صرف دو چہرے مستقل تھے۔ بڑی کرسی پر بیٹھے ان کے نانا اور ان کے برابر کی کرسی پر بیٹھے وہ خود۔ لوگ آتے رہتے تھے، باری باری سے میز پر بیٹھ کر کھانا کھاتے رہتے تھے۔ جانے کہاں کہاں سے آدمی عورتیں آتے رہتے۔ اس گھر میں سب کو کھانا کھلانے کا رواج تھا۔ وہاں کچھ بھی نجی نہیں تھا، سب کچھ عوامی تھا۔ ان کے نانا تنہائی پسند نہیں تھے، وہ مجلسی آدمی تھے۔ اس سے مارکیز کو ادیب کے طور پر جو ایک بڑا فائدہ ہوا وہ یہ کہ بچپن سے ہی ان کا پالا طرح طرح کے کرداروں سے پڑا جس سے انہیں آدمی کے عادات و اطوار کو سمجھنے کا موقع ملا، ان سے ملنے کا موقع ملا۔

جب مارکیز آٹھ سال کے تھے تو ان کو ارکاٹک چھوڑ کر جانا پڑا۔ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ رہنے چلے گئے تھے۔ یہ ان کے لئے ارکاٹک کا بھی خاتمہ تھا۔ اُن کو دور بھیج دیا گیا۔ جہاں سے وہ قانون کی پڑھائی درمیان میں چھوڑنے تک واپس نہیں آئے اور وہ بھی بہت کم وقت کے لئے۔ انھوں نے اُس چیز کی اداسی کو محسوس کیا جس کا وجود ختم ہو چکا تھا اور جسے واپس لانا ممکن نہیں تھا۔ اُن کا ادیبانہ تجسس یہیں سے بیدار ہوا۔ گزرا ہوا وقت کہاں چلا جاتا ہے، کیا کوئی صورت ہوتی ہے اُس کو واپس لانے کی، اُس کی زندہ دلی میں جینے کی۔ جواب ملا۔ شاید تحریر کے توسط سے اُس مردہ سمجھ لئے گئے وقت کو زندہ کیا جا سکتا ہے۔ اس خیال نے اُن کی تحریر کو ایک مقررہ سمت دی۔ ٹھوس نظریاتی زمین دی، ایک مقصد دیا۔

اپنے نانا کا وہی مکان بیچنے اپنی ماں کے ساتھ وہ پہنچے۔ ایک وقت میں لوگوں اور رنگ برنگی چھتریوں سے بھرا رہنے والا اسٹیشن کھنڈر اور ویران ہو چکا تھا۔ دوپہر کی گونجتی خاموشی میں جسے ٹڈوں کی آواز توڑ رہی تھی، انھیں چھوڑ کر ریل گاڑی ایسے آگے چل پڑی جیسے وہ کسی آسیبی شہر سے گزری ہو۔ سب کچھ برباد اور اجڑ ہوا لگ رہا تھا۔ لاپروائی اور گرمی کا شکار۔ پرانے لکڑی کے مکانوں اور اہم چوراہے کے بادام کے پیڑوں پر برسوں کی گرد جمی ہوئی تھی۔ گلیوں میں چلتے ہوئے جذباتی ہو گئے گابرئیل اور اس کی ماں اس تہس نہس منظر کو دیرینہ یادوں کے خوشحال اور بھیڑ بھاڑ والے منظر سے جوڑ کر دیکھنے کی کوشش کرتے رہے۔ مکان اور مقامات ان کی پہچان میں نہیں آ رہے تھے اور یہ یقین کرنا مشکل تھا کہ کبھی یہ گھر باعزت خاندانوں کے رہنے کے ٹھکانے تھے جس میں ڈچ لیسز پہنے عورتیں اور رعب دار مونچھوں والے سنجیدہ جنرل رہا کرتے تھے۔

ارا کاٹک شہر، اس کے گھر، ان گھروں میں رہنے والے لوگ مارکیز کی یادوں میں اس طرح رچ بس گئے تھے کہ انہوں نے بعد میں ان کے بارے میں کافی کچھ لکھا۔ سب سے پہلے انہوں نے 'دی ہاؤس' نام کا ایک ناول لکھنا شروع کیا جس کی کہانی ظاہر ہے اسی گھر سے متعلق تھی۔ بعد میں جب ماں کے ساتھ تیئس سال کی عمر میں وہاں کا سفر کیا تو واپس آ کر اپنا پہلا ناول لکھا۔ 'لیف اسٹارم' آخرکار وہ ناول لکھا جس نے نہ صرف اس شہر کو بلکہ اس کی اس عظیم حویلی کو بھی امر بنا دیا جس میں ان کا بچپن گزرا تھا۔ 'ون ہنڈریڈ ائیرس آف سالیٹیوڈ' یہی نہیں متعدد کہانیوں میں بھی ان کے بچپن کی یادیں بکھری پڑی ہیں۔

❑❑❑

ہندی سے اردو ترجمہ 'نجیب انصاری'

واقعات کے رونما ہونے کے احساس کا نام ہے 'تنہائی کے سو سال'

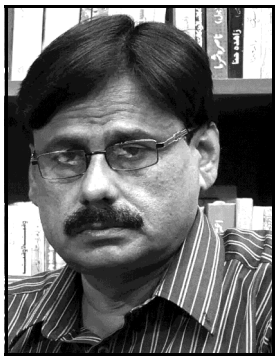

خالد جاوید

اردو کے انوکھے فکشن نگار
گارسیا گابرئیل مارکیز اور میلان کنڈیرا
پر اردو میں کتابیں شائع، دو ناول اور
تین افسانوی مجموعے بھی شائع، بریلی
کالج میں پانچ سال تک فلسفہ پڑھانے
کے بعد فی الحال جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی
میں اردو کے ایسوسی ایٹ پروفیسر
بنیادی طور پر افسانہ نگار
وطن بریلی

شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی
رابطہ: 9810596212

'تنہائی کے سو سال' مارکیز کا سب سے معروف ناول ہے۔ اس ناول نے مارکیز کو ساری دنیا میں مشہور کر دیا۔ ۱۹۸۲ء میں اسے نوبل پرائز دیا گیا اس کے بعد ستائیس زبانوں میں اس کے ترجمے شائع ہوئے جن کے سیکڑوں ایڈیشن آج بھی چھپتے رہتے ہیں۔ ساری دنیا کے فکشن پر اس عظیم اور انوکھے ناول کے اثرات محسوس کئے جاتے رہے ہیں۔ لاطینی امریکہ کے ادب میں بوم کے جس عہد کا تذکرہ کیا جاتا ہے، اس کو عروج تک پہنچانے اور عالمی ادب میں پوسٹ ماڈرن ناول کے ارتقا میں تنہائی کے سو سال کا بہت زیادہ تعاون ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ڈان کیہوٹے کے بعد یہ اسپینی زبان کا دوسرا ناول ہے جو کمرشیل اعتبار سے بھی اتنا کامیاب رہا ہے۔ نوبل انعام ملنے سے پہلے اسے ۱۹۶۹ء میں فرانس کے باوقار ادبی انعام Prixdu Mailleur Etranger سے بھی نوازا گیا اور ۱۹۷۲ء میں یہ وینی زولا کے رومولو گیلیگوز انعام کا بھی حقدار ٹھہرایا گیا۔ ۱۹۹۲ء میں ناول کی پچیسویں سالگرہ کے موقع پر موقر عالمی ادبی جریدے Wasafiri نے بین الاقوامی ادیبوں کا ایک سروے شائع کیا جس میں سب نے اس حقیقت کو قبول کیا ہے کہ پچھلے پچیس سالوں میں گابریل گارسیا مارکیز کے اس عظیم ناول نے ساری دنیا کے ادب کو متاثر کیا ہے اور نئی راہیں دکھائی ہیں۔ مشہور چیک ناول نگار میلان کنڈیرا نے کہا کہ جب تنہائی کے سو سال جیسا ناول موجود ہے تو ناول کی موت کا اعلان کرنا محض لغویت ہوگا۔

۱۹۷۰ء میں ناول پر ریویو کرتے ہوئے ولیم کنیڈی نے نیشنل آبزرور میں لکھا تھا کہ Book of Genesis کے بعد یہ پہلا ادبی شاہکار ہے جسے تمام نسل انسانی کو پڑھنا چاہئے مگر بذات خود مارکیز کے لینا ول کی یہ مقبولیت ایک معمہ بنی رہی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ زیادہ تر نقاد یہ سمجھ ہی نہیں پاتے ہیں کہ تنہائی کے سو سال کو ایک لطیفے کی شکل میں بھی دیکھنا چاہئے۔

جو بھی ہو مگر یہ درست ہے کہ ناول کی مقبولیت میں اس کے اندر پوشیدہ مزاح کا ہاتھ بہت رہا ہے۔ ہولناک تشدد کو مارکیز بیان نہیں کر سکتا تھا اس لئے اس نے مزاح لطیفوں اور صبر کا سہارا لیا ہے۔ جب تشدد آس پاس کی دنیا اور اس کے لوگوں کے لئے اتنی عام اور روزمرہ کی شئے بن گئی تو مارکیز جیسے جینوین ادیب کے لئے اسلوب کو اپنانا ہی افضل تھا۔

پلینو ااپولیومیندوزا نے اپنے مضمون 'گابرئیل' میں لکھا ہے کہ اس نے ایک نئے ناول کا ذکر کیا جس پر وہ ان دنوں کام کر رہا تھا، یہ ایک بولیرو کی طرح ہے اس نے کہا بولیرو لاطینی امریکی موسیقی کی سب سے زیادہ مستند طرز ہے۔ اب تک اس نے میز پر انگلیاں رکھ کر انہیں وسط کی طرف چلاتے ہوئے کہا میں نے اپنے ناولوں میں محفوظ ترین راستہ اختیار کیا ہے۔ میں نے کوئی خطرہ مول نہیں لیا۔ اب مجھے محسوس ہوتا ہے کہ مجھے کھائی کے کنارے کنارے چلنا ہے اور اس کی انگلیاں میز کے کنارے پر خطرناک انداز میں لڑکھڑاتے ہوئے چلنے لگیں۔ سنو، اس کتاب میں جب ایک کردار گولی مار کر خودکشی کرتا ہے تو اس کے خون کی پتلی سی لکیر شہر میں بہتی آخرکار مرنے والے کی ماں تک پہنچ جاتی ہے۔ پوری کتاب اس طرح کی ہے رفعت اور عامیانہ پن کے درمیان کی تیز دھار پر چلتی ہوئی بالکل بولیرو کی طرح پھر اس نے اضافہ کیا یا تو یہ کتاب میری کامیابی ہوگی یا پھر میں اپنا سر گولی سے اڑا دوں گا۔ بلاشبہ وہ تنہائی کے سو سال کے بارے میں بات کر رہا تھا۔

(ترجمہ اجمل کمال، مارکیز منتخب تحریریں، آج، کراچی ۱۹۹۳ء)

مارکیز نے یہ ناول اٹھارہ مہینے میں مکمل کیا۔ یہ اس کی غریبی کے دن تھے، اس کے جوتے پھٹے ہوئے تھے، اس کی بیوی ادھار مانگ کر گھر چلاتی تھی مگر جب ناول شائع ہو کر منظر عام پر آیا تو ایک ناقابل یقین کرشمہ ثابت ہوا۔ اس اچھوتی تخلیق کے سحر میں ساری ادبی دنیا گرفتار ہوگئی اور اس نے ناول کی تعریف اور تاریخ دونوں کو بدل کر رکھ دیا۔

جب مارکیز نے اپنے دوست پولیومیندوزا سے بولیرو کا ذکر کیا تھا تو وہ جس اسلوب کی طرف اشارہ کر رہا تھا، وہ روایتی اور حقیقت پسندانہ یا دستاویزی ناول نگاری سے مختلف ایک جہت تھی۔ اس مقام سے تنہائی کے سو سال پر جادوئی حقیقت نگاری کا اطلاق کیا جانے لگا مگر غور کرنے کی بات یہ ہے کہ ناول میں واقعات اس طرح پیش کئے گئے ہیں جیسے وہ درحقیقت رونما نہیں ہوئے ہیں بلکہ وہاں کے لوگوں نے انہیں ایسا ہوتے ہوئے دیکھا یا محسوس کیا۔ مثال کے طور پر ایک دوپہر باغیچے میں کپڑے سکھاتے سکھاتے ریوموڈیوس چادر تھامے ہوا کے جھونکے کے ساتھ اوپر اڑ جاتی ہے اور آسمان میں غائب ہو جاتی ہے۔ ناول کے پلاٹ میں اشارہ موجود ہے کہ کچھ لوگوں کا ماننا تھا کہ وہ کسی مرد کے ساتھ بھاگ گئی تھی اور اس کے خاندان والوں نے بدنامی کے بچنے کے لئے یہ کہانی گڑھ لی تھی۔ اصل میں تنہائی کے سو سال ماکاندو کی تاریخ کو اس روپ میں پیش کرتا ہے جیسی کہ وہ زبان لوک روایت میں درج ہوئی اور نسل در نسل اسے یاد کیا جاتا رہا۔

مگر پھر بھی تنہائی کے سو سال میں ابہام کے قومی پہلو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ ناول میں زمان و مکان کے بھی تمام سانچے ٹوٹ کر رہ جاتے ہیں۔ وقت سیدھی لکیر میں آگے نہیں بڑھتا بلکہ دائروں میں آگے بڑھتا ہے۔ تاریخ اس طرح خود کو دہراتی ہے کہ ایک قسم کی ابدیت سارے ناول پر آسیب کی طرح مسلط ہوجاتی ہے۔ یہ اسلوب قاری کو پریشان اور حیران کر کے رکھ دیتا ہے۔ ناول سات نسلوں کی کہانی بیان کرتا ہے۔ اگرچہ یہاں وقت کا کوئی سراغ، کوئی نشان تک نہیں ملتا۔ سو سال کے لفظ سے ہمیں یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہئے کہ ناول سو سالوں پر محیط ہے۔ ہر قاری اپنے طور پر کچھ بھی نتیجہ نکالنے میں حق بجانب ہوگا کیونکہ ناول میں تو وقت سیال ہو کر بہہ رہا ہے۔

سات نسلوں کا یہ قصہ ماکاندو میں تشکیل پاتا ہے۔ یہ ماکاندو کی کہانی ہے۔ ہر نسل میں تقریباً دس نام بدل بدل کر آتے رہتے ہیں۔ اس لئے ناول کی ابتدا میں مارکیز نے خاندان کا شجرہ بھی گراف کی شکل میں بنا دیا ہے جس کی وجہ سے قاری کو قدرے آسانی ہوجاتی ہے۔ تنہائی کے سو سال میں ماکاندو کے حوالے سے کولمبیا اور لاطینی امریکہ کی پوری تاریخ اپنی جھلک دکھا دیتی ہے مثلاً ناول میں بنانا کمپنی کا آنا اور ماکاندو میں انڈسٹریز قائم کرنا، بنانا کمپنی کے ذریعہ کھیت کے مزدوروں کی ہڑتال اور ان کا قتل عام وغیرہ یہ سب کولمبیا میں یونائیٹڈ فروٹ کمپنی کی آمد اور معاشی سرمایہ داری اور بھوک ہڑتال کی یاد دلاتی ہے۔ ناول میں بنانا قتل عام ماکاندو میں زبردست تبدیلی لاتا ہے۔ بارش شروع ہو جاتی ہے اور تقریباً ساڑھے چار سال تک لگاتار بارش ہوتی رہتی ہے۔ ماکاندو تباہ ہو جاتا ہے اور وہاں کے لوگ اخلاقی زوال کا شکار ہو جاتے ہیں۔ محرم آپس میں جنسی تعلقات قائم کر لیتے ہیں اور بالآخر ان کے جو اولاد پیدا ہوتی ہے اس کے سور کی دم ہے یعنی وہ بدشگونی، وہ خوف جو ابتدا سے ہی ناول پر چھائے رہتے ہیں آخر میں درست ثابت ہوتے ہیں۔

تنہائی کے سو سال میں لبرل پارٹی اور کنزرویٹیو پارٹی کے درمیان جنگ چلتی رہتی ہے اور جب اویلیانو بوئندیا کے ہاتھ میں طاقت آتی ہے اور وہ اقتدار حاصل کرتا ہے تو اسے کرنل کا لقب حاصل ہو جاتا ہے۔ اب وہ ایک ڈکٹیٹر بن جاتا ہے اور اپنے قریبی عزیز دوست کرنل جیری نالڈو مارکیز کو اختلاف کی بنا پر سزائے موت سنا دیتا ہے۔

ایک بات تو بالکل صاف ہے کہ مارکیز ہر قسم کی ڈکٹیٹرشپ کے خلاف ہے۔ وہ اس سرمایہ داری کے بھی خلاف ہے جو ترقی یافتہ ممالک کے ذریعہ تیسری دنیا میں کی جاتی ہے اور ان ممالک کا استحصال کیا جاتا ہے، مارکیز کو کمیونزم میں یقین نہیں ہے، وہ کسی بھی کٹرپن کا حامی نہیں۔ تنہائی کے سو سال میں وہ لاطینی امریکہ کے عوام کو یہ پیغام ضرور دینا چاہتا ہے کہ انہیں ایسے تمام آمروں کے خلاف متحد ہو کر جنگ کرنا چاہئے جو عوام پر ظلم ڈھاتے ہیں۔ مارکیز لاطینی امریکہ میں سیاسی تبدیلی کا خواہاں ہے اور یہ ہرگز ضرور نہیں سمجھتا کہ یہ تبدیلی محض تشدد کے ذریعہ ہی لائی جاسکتی ہے اس لئے

بھلے ہی اس میں ہمیں کتنے لطیفے اور تفریحی عناصر نظر آئیں، ہمیں مارکیز کے اور کسی بھی ادیب کے ایسے بیان سے پورا پورا متفق ہرگز نہیں ہونا چاہئے اور نہ اس پر آنکھ بند کر کے یقین کر لینا چاہئے کہ تنہائی کے سو سال ایک عمدہ کھلونا ہے اور اسے سنجیدگی سے نہیں لینا چاہئے۔

دراصل تنہائی کے سو سال ایک بہت ہی سنجیدہ اور اعلیٰ مقصد رکھنے والا ناول بھی ہے۔ ایک طرف تو ناول میں لاطینی امریکہ کی تاریخ کو گویا دوبارہ سے لکھا گیا ہے مگر دوسری طرف آکر میں قاری کو یہ تنبیہ بھی ملتی ہے کہ ناول بہرحال ایک تخلیقی اسٹرکچر ہی کا نام ہے۔ وہ کوئی آئینہ نہیں جو کہ حقیقت کو باریکی سے اور معروضی خوردبینی کے ساتھ سامنے لا سکے۔ یہی وہ رمز ہے جو اس ناول کو انوکھا پن اور عظمت کا عنصر فراہم کرتا ہے۔ یہی رمز تنہائی کے سو سال کی سات نسلوں پر محیط اس ہولناک کہانی کا ہر کردار اپنے اندر پیوست رکھتا ہے۔ حوزے آرکادیو بائن دیا، ارسلا گواران، ربیکا، پیلار تیزا، اور یلیانو حوزے، حوزے آرکادیو سیگندو اور ریمادیوس وغیرہ سارے کردار جس ابہام میں گھرے ہوئے محسوس ہوتے ہیں وہ محض طلسمی حقیقت نگاری کرنے کے لئے مصنف کے تختۂ مشق نہیں ہیں۔ اس دھند کے عقب میں جو بھی ہے وہ حقیقت ہی ہے۔ ذیل میں مارکیز کے یہ بیانات دیکھیں جن سے اس کے موقف کی تھوڑی بہت وضاحت ضرور ہو جاتی ہے۔

۱۔ لکھنے کے ہنر کی طویل تربیت کے دوران جو ہستی سب سے بڑھ کر میری اولین مددگار ثابت ہوئی وہ میری نانی تھیں۔ وہ مجھے انتہائی ہولناک قصے پلک جھپکائے بغیر یوں سناتی تھیں گویا یہ سب انہوں نے ابھی ابھی دیکھا ہو۔ یہ ان کا موثر انداز اور امیجز کی فراوانی تھی جس کے باعث ان کی کہانیاں اتنی قابل یقین لگتی تھیں۔ میں نے تنہائی کے سو سال میں اپنی نانی ہی کا طریقۂ کار استعمال کیا ہے۔

۲۔ مجھے فینٹیسی سے نفرت ہے کیونکہ میں تخیل کو حقیقت کی تخلیق کا ذریعہ سمجھتا ہوں اور یہ کہ تخلیق کا سرچشمہ آخری تجربے میں حقیقت ہی ہے۔

۳۔ میں نے اپنی تحریروں میں خصوصاً تنہائی کے سو سال اور سردار کے زوال میں حقیقت کو جس طرح برتا ہے اسے طلسمی حقیقت نگاری کا نام دیا گیا ہے۔ میرے یوروپین قارئین غالباً میری کہانیوں کے طلسم سے تو باخبر ہوتے ہیں لیکن ان کے عقب میں چھپی حقیقت کو نہیں دیکھ پاتے۔ اس کی وجہ یقیناً یہ ہے کہ حقیقت ٹماٹروں اور انڈوں کے بھاؤ تک محدود نہیں۔ لاطینی امریکہ کی روزمرہ زندگی یہ ثابت کرتی ہے کہ حقیقت نہایت غیر معمولی باتوں سے بھری پڑی ہے۔

۴۔ میری کتابوں کا ایک وقفہ بھی ایسا نہیں جس کی بنیاد حقیقت پر نہ ہو۔ تنہائی کے سو سال میں بعید از قیاس چیزیں پیش آتی ہیں۔ حسین ریمیدیوس بلند ہو کر آسمان میں چلی جاتی ہے۔ زرد تتلیاں موریسیو کے گرد منڈلاتی رہتی ہیں۔ یہ سب کچھ حقیقت پر مبنی ہے۔

(ترجمہ اجمل کمال، بحوالہ امرود کی مہک، آج، کراچی ۱۹۹۳ء)

مارکیز کے مطابق تنہائی کے سو سال روزمرہ کی زندگی سے متعلق ہے یہ ہر شخص کی زندگی کی کہانی ہے اور بیحد سادہ اور سطح انداز بیان میں لکھی گئی ہے۔ بوئندیا خاندان کی تنہائی مارکیز کے خیال میں اس سبب سے ہے کہ ان میں محبت نہیں ہے، ایک پوری صدی کے آخر میں سور کے دم والا اس خاندان کا واحد فرد ہے جس کی پیدائش محبت کے نتیجے میں ہوتی ہے۔ یہ لوگ محبت کرنے کے اہل ہی نہیں تھے اور یہی ان کی تنہائی کا سبب ہے۔

مارکیز نے اس ناول کو اٹھارہ برس کی عمر میں لکھنے کا ارادہ کیا تھا اور اسے 'مکان' کا عنوان بھی دیا تھا مگر لکھا نہ سکا۔ کہانی پندرہ برس تک اس کے ذہن میں گھومتی رہی، مارکیز کو اپنی لے کی کھوج تھی۔ ایک روز جب مارکیز اور اس کا خاندان کار میں بیٹھنے اکاپلکو جا رہے تھے۔ اچانک مارکیز کے ذہن میں بجلی کی طرح یہ خیال آیا کہ اسے کہانی اس طرح بیان کرنا چاہئے جیسے اس کی نانی سنایا کرتی تھیں، بس پھر مارکیز نے کار کا رخ موڑ دیا اور گھر پہنچ کر لکھنا شروع کر دیا۔

تنہائی کے سو سال پڑھ کر کوئی بھی یہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ ناول میں جتنی بھی حماقتیں اور جنگ بازیاں ہوتی ہیں وہ مردوں کے ذریعہ ہوتی ہیں۔ مارکیز کے خیال میں دنیا کا جاری و ساری رہنا عورتوں کی بدولت ہے۔ عورتیں عقل مند ہوتی ہیں اور مرد احمق۔

ان باتوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جادوئی حقیقت نگاری کے عقب میں صرف حقیقت ہی ہوتی ہے اور تنہائی کے سو سال پڑھتے وقت محض ایسی چیزوں سے حظ اٹھانا ناول کو نہ پڑھنے کے مترادف ہوگا بلکہ یہ دیکھنا چاہئے کہ اس سحر انگیز بیان کی زیریں سطح پر جو ہولناک حقیقت اور وجود کی دہشت کارفرما ہے اس کا علم و عرفان ہمیں ہوا یا نہیں۔ یہ قاری کے لئے یقیناً ایک آزمائش تو ہے کیونکہ وہ کافکا کو فینٹسی کی سطح پر سمجھ سکتا تھا۔ یہی معاملہ ذرا بدلے ہوئے انداز میں بورخیس کے ساتھ بھی تھا۔ اٹیلو کیلونیو کو بھی تفریح لے کر پڑھ سکتا تھا مگر مارکیز کو سمجھنے کے لئے اسے تربیت درکار تھی، خاص طور پر یوروپی قارئین اور ناقدین کے لئے۔ مثال کے طور پر تنہائی کے سو سال میں یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> جیسے حوضے آرکادیو نے سونے کے کمرے کا دروازہ بند کیا سارا گھر گولی کی آواز سے گونج اٹھا، خون کی ایک دھار دروازے کے نیچے سے نکلی، صحن پار کیا، باہر سڑک پر آ گئی اور اونچے نیچے چبوتروں پر سیدھی چلتی گئی۔ سیڑھیاں اتری اور منڈیریں چڑھی، ترکوں کی گلی سے ہوتے پہلے دائیں مڑی پھر بائیں، بوئندیا کے گھر کے آگے سیدھا زاویہ بنایا، بند دروازے کے نیچے سے اندر

داخل ہوئی، قالین گندا نہ ہو اس لئے دیواروں کے ساتھ ساتھ چلتے مہمانوں کی بیٹھک پار کی، دوسری بیٹھک میں گئی، کھانے کی میز سے بچنے کے لئے چوڑا گھماؤ لیا۔ بگونیا کے برآمدے سے گزری اور یلینوا حوزے کو حساب کا سبق پڑھاتی امارانتا کی کرسی کے نیچے سے بغیر نظر آئے آگے بڑھی اور بھنڈار سے ہوتی ہوئی رسوئی میں جا کر نکلی جہاں ارسلا ڈبل روٹی بنانے کے لئے چھتیس انڈے توڑ رہی تھی۔

'ہائے میری ماں' ارسلا چلائی۔ اس نے خون کی دھار کا الٹی سمت میں تعاقب کیا اور اس کے مآخذ کی تلاش میں وہ بھنڈار پار کر کے بگونیا کے برآمدے سے گزری جہاں اوریلیانو حوزے تین دونی چھ اور تین تیا نو رٹ رہا تھا اور کھانے کے کمرے اور بیٹھکوں سے ہوتی سیدھی سڑک پر آ گئی اور پھر پہلے دائیں اور پھر بائیں مڑ کر ترکوں کی گلی تک پہنچ گئی۔ اس بات سے بے خبر کہ وہ نانبائی کا ایپرن اور گھریلو چپلیں پہنے ہی آ گئی تھی اور چوک پر نکل کر وہ ایسے مکان کے دروازے کے اندر گھسی جس میں وہ پہلے کبھی نہ آئی تھی اور اس نے سونے کے کمرے کا دروازہ دھکیل کر کھولا جہاں جلے ہوئے بارود کی بو سے اس کا دم ہی گھٹ گیا اور اس نے حوضے آرکادیو کو اپنے اتارے ہوئے موزوں کے اوپر منھ کے بل زمین پر پڑا پایا اور خون کی دھار کا اصل اور بنیادی نقطہ دیکھا جو اب دائیں کان سے بہنا بند ہو گئی تھی۔

اس عجیب وغریب اور جادوئی سے منظر کے عقب میں ماں بیٹے کے خونی رشتے کی باہمی کوشش کو جس المناک انداز میں دیکھا جا سکتا ہے اس کی مثال نہیں ہے۔ استعارہ (Irony) اور تخیل سے مل کر ایسی جاندار حقیقت کی تشکیل کی گئی کہ اسے ایک معجزاتی کارنامہ ہی کہا جا سکتا ہے اور وہ تنہائی ارسلا کا بھی مقدر ہے اور اس بدنصیب خون کی لکیر کا بھی اور یہی وہ دہشت اور تنہائی ہے جو مارکیز کی اس شاہکار تصنیف کی ہر ہر سطر میں سمائی ہوئی ہے۔

مشہور ناقد مائیکل وڈ کے مطابق کولمبیا کی زیادہ تر تاریخ دبے پاؤں تنہائی کے سو سال میں چلی آئی ہے۔ انیسویں صدی میں اصطلاحات پر بحثیں، ریلوے کی آمد، ہزار روزہ جنگ، امریکن فروٹ کمپنی، سنیما، موٹر کاریں، ہڑتالی کھیت، مزدوروں کا قتل عام جو مارکیز کی پیدائش کے بعد ہوا تھا، کولمبیا کی تاریخ سے ناول کے واقعات کی ان مطابقتوں نے کئی نقادوں کو یہ خیال کرنے پر آمادہ کیا ہے کہ مارکیز ایک قطعی مخصوص طور پر ایک کولمبین ادیب ہے جو اپنے کرداروں کی تمام تاریخ پر حاوی ہے۔

(ترجمہ اجمل کمال، مارکیز کی منتخب تحریریں، آج، کراچی ۱۹۹۳ء)

تاریخ کے تعلق سے ولیم رو نے لکھا ہے کہ عام لوگوں کی یادداشت ان کے حالات کے مطابق تبدیل ہوتی رہتی ہے اور غیر متعین ہوتی ہے۔ یہ یادداشت نئے سرے سے تشکیل پاتی رہتی ہے مگر ایک بار یہ یادداشت جب تحریری ضابطے میں آ جاتی ہے تو پھر اس میں تبدیلی کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ تنہائی کے سو سال کو اس حوالے سے بھی سمجھا اور پڑھا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر ماکاندو کے باشندوں پر بے خوابی کی وبا کا نازل ہونا اور جس کی وجہ سے لوگ چیزوں کے نام بھول جاتے ہیں اور تب حوزے آرکادیو بوئندیا یادداشت کی مشین ایجاد کرتا ہے۔ مندرجہ ذیل اقتباس دیکھیں:

> قلم دوات لے کر ہر شئے پر اس کا نام لکھ دیا گیا۔ میز، کرسی، گھڑی، دروازہ، دیوار، پلنگ، بھگوڑا، پھر باڑے میں گئے اور جانوروں اور پودوں پر بھی نشان لگا دئے۔ گائے، بکری، سوری، مرغی، کیلا۔ آہستہ آہستہ فراموشی کے وسیع ممکنات پر غور کرتے ہوئے وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ ایک دن ایسا آ سکتا تھا جب چیزوں کو اس کے نام سے تو پہچانا جا سکتا ہو لیکن ان کا استعمال نہ یاد کیا جا سکے۔ تب وہ اور بھی زیادہ تشریح سے کام لینے لگے۔ گائے کے گلے میں لٹکایا ہوا نام پٹہ اسی کا مثالی نمونہ تھا۔ 'یہ گائے ہے۔ اسے صبح ہر روز دوہنا چاہئے تا کہ یہ دودھ دے سکے اور دودھ کو ابالنا چاہئے تا کہ اسے کافی میں ملایا جا سکے اور دودھ والی کافی بنائی جا سکے۔'

مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ فراموشی کا خاتمہ کر کے یہ ترکیب تبدیلی کا بھی خاتمہ کر دیتی ہے۔ ولیم رو کا کہنا ہے کہ اس طرح دنیا صرف ڈکشنری کی غلام بن جاتی ہے۔ ناول میں بے خوابی کی دنیا وبا کو اسی روشنی میں دیکھنا چاہئے۔ احساس جمود اور ناقابل فرار تقید تحریری شکل جو ایک بند ساخت ہے اور اپنی خود کفالت میں قید ہے۔ بوئندیا خاندان کے ساتھ یہی المیہ پیش آیا ہے۔ ولیم رو کا نظریہ پوسٹ ماڈرن نظر آتا ہے خاص طور پر یہاں دریدا کی بازگشت صاف سنائی دے رہی ہے۔

تنہائی کے سو سال، ایک ناقابل فراموش ادبی شاہکار ہے۔ یہ اس کی پیچیدہ تخلیقی قوت کا ثبوت ہے کہ نقاد اس کے بارے میں ابھی بھی حتمی طور پر کچھ کہہ پانے سے قاصر ہیں۔ اعلیٰ تخلیق کی خوبی یہ ہے کہ اس کے اندر ہزاروں معنی ومفاہیم پوشیدہ رہتے ہیں اور اس کے وسیلے سے تنقید کا بھی ارتقا ہوتا رہتا ہے۔

تنہائی کے سو سال ایک ایسا ناول ہے جسے مزاحیہ ناول سمجھ کر بھی پڑھا جا سکتا ہے اور جس کی ہولناک تنہائی کو محسوس کر کے قاری خود اپنے وجود کے کرب اور لازمی تنہائی کو بھی دریافت کر سکتا ہے جہاں تک مارکیز کا سوال ہے تو اس نے نوبل انعام قبول کرتے وقت اپنی تقریر میں ایک جملہ یہ بھی کہا تھا۔ اس ناول کے آخری جملے کو الٹ دیا تھا۔ 'سو سال کی تنہائی کی سزا پانے والوں کو زمین پر ایک موقع اور دینا چاہئے۔'

❑❑❑

گابرئیل گارسیامارکیز کے شاہکار 'تنہائی کے سو سال' کے اقتباسات

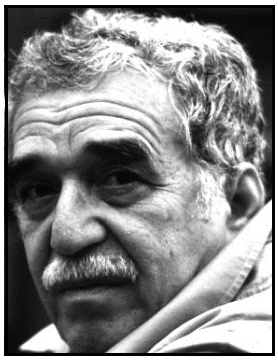

گابرئیل گارسیامارکیز

بیسویں صدی کے مشاہیر ادیبوں میں نمایاں نام، ۱۹۸۲ء میں ادب کے نوبل انعام سے سرفراز، چھ ناول اور پانچ ناولٹ سات افسانوی مجموعوں کے ساتھ آٹھ نان فکشن کی کتابیں شائع، درجنوں فلموں کی اسکرپٹ رائٹنگ کے علاوہ تا حیات صحافت سے وابستہ وطن اراکاٹک (کولمبیا)

پیدائش: ۶/مارچ ۱۹۲۷ء
وفات: ۱۷/اپریل ۲۰۱۴ء

فاختہ کی طرح سفید نئے گھر کا افتتاح ایک ڈانس کے ساتھ ہوا۔ اُرسلا کے ذہن میں یہ خیال اس دوپہر ہی آ گیا تھا جب اس نے ریبیکا اور امارانتا کو سن بلوغ میں پہنچتے پایا تھا اور یہاں تک کہا جا سکتا ہے کہ نئی تعمیر کا اہم سبب ہی یہ خواہش تھی کہ لڑکیوں کے لئے مہمانوں کی خاطر تواضع کے لئے مناسب جگہ ہو، تاکہ اس کوشش کی شان وشوکت میں کمی نہ رہے۔ تعمیراتی کام کے دوران وہ غلاموں کی طرح لگی رہی۔ نتیجتاً کام ختم ہونے سے پہلے ہی اس نے سجاوٹ کے لئے مہنگی سے مہنگی چیزوں کی فرمائش کر دی تھی اور ساتھ میں اس تعجب خیز کھوج کی بھی جو شہریوں کی حیرانی اور نوجوانوں کے جوش کا سبب بننے والا تھا: ایک پیانولا۔ وہ ٹکڑوں میں آیا، ڈھیر سارے ڈبوں میں بندھا ہوا جنہیں ویانائی فرنیچر، بوہمیا کے کرسٹل، انڈیز کمپنی کی کٹلری، ہالینڈ کے میز پوش اور مختلف قسم کے چراغ اور شمعدان اور سُر ملانے کے لئے خریداروں کو اس کے بجانے سے متعلق ہدایت دینے کے لئے اور ساتھ آئی چھ کاغذ کی انڈکس میں چھپی جدید ترین موسیقی پر انہیں ڈانس سکھانے کے لئے برآمد کنندگان نے اپنے خرچ پر پی ایترو کرسپی نامی اطالوی ماہر کو ساتھ بھیجا تھا۔

پی ایترو کرسپی نوجوان اور گورا تھا۔ ماکوندو میں دیکھا گیا، سب سے پرکشش اور مہذب نوجوان، لباس کے تئیں اتنا بیدار کہ شدید گرمی کے باوجود بروکیڈ کی واسکٹ اور گہرے رنگ کے موٹے کپڑے کا کوٹ پہن کر کام پر آتا تھا۔ پسینے میں تر، گھر کے مالکان سے مؤدب فاصلہ رکھتے ہوئے ویسا ہی انہماک بنائے ہوئے جیسا کہ اوریلیانو کی کیمیا کی لیبوریٹری میں تھا، وہ کئی ہفتوں تک کمرے میں بند رہا۔ ایک صبح، بغیر دروازہ کھولے، کرشمہ کی شہادت کے لئے بغیر کسی چشم دید گواہ کو بلائے، اس نے پہلی انڈکس پیانولا پر رکھی اور لکڑی چیرنے کی مسلسل آواز وہتھوڑی کی چوٹ موسیقی کے ایقان نیز ستھرے پن کے آگے ایک تعجب خیز سکوت میں تھم گئی۔ سبھی کمرے میں دوڑے آئے۔ کھوسے آرکادیو بوئن دیا پر تو جیسے بجلی گر گئی، وجہ موسیقی کی لہروں کی خوبصورتی نہیں تھی بلکہ پیانولا کی خودکار کنجیوں اور نادیدہ موسیقار کا واگپور ٹائپ پانے کی امید میں انہوں نے کمرے میں ملکیادیس کا کیمرہ کھڑا کر دیا۔ اس دن اطالوی نے کھانا ان کے ساتھ کھایا۔ ریبیکا اور امارانتا جو کھانا نکال رہی تھیں، اس گورے، انگوٹھی سے عاری ہاتھوں والے فرشتے جیسے نوجوان کا میز کا سلیقہ دیکھ کر دنگ تھیں۔ مہمانوں کے کمرے سے ملحق دوسرے کمرے میں پی ایترو کرسپی انہیں ڈانس سکھائے گا۔

انہیں چھوئے بغیر تال پیا سے تال رکھتے ہوئے وہ انہیں ڈانس کے قدم بتاتا اور یہ اُرسلا کی دوستانہ دیکھ ریکھ میں ہوتا تھا جولڑکیوں کے ڈانس سیشن کے دوران ایک لمحہ کے لئے بھی کمرہ نہ چھوڑتی تھی۔ ان دنوں پی ایترو کرسپی ایک خاص طرح کی بڑی لچیلی اور تنگ پتلونیں پہنتا تھا اور ڈانس کی جوتیاں، 'اتنی فکر کی بات ہی نہیں ہے'، کھوسے آرکادیو بوئن دیا نے بیوی سے کہا، 'یہ آدمی مہرا ہے۔' لیکن پھر بھی جب تک ٹریننگ ختم نہ ہوئی اور اطالوی ماکوندو سے چلا نہ گیا، ارسلا چوکس بنی رہی۔ پھر دعوت کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ ارسلا نے مہمانوں کی ایک منتخبہ فہرست بنائی جس میں صرف ماکوندو کے بنیادگزاروں کی نسل کے لوگوں کو منتخب کیا گیا سوائے پیلار تیرنیرا کے خاندان کے جس کی دو اولادیں اور ہوگئی تھیں جن کے باپ کون تھے، کچھ پتہ نہ تھا۔ فہرست واقعی اعلیٰ طبقہ کی تھی، سوائے اس کے کہ اسے بنانے میں دوستی کا جذبہ حاوی رہا تھا کیونکہ فہرست میں شامل افراد نہ صرف ماکوندو کی تاسیس اور اسے بسانے کے لئے کئے گئے سفر کے پہلے سے کھوسے آرکادیو بوئن دیا کے پرانے دوست تھے بلکہ ان کے پسر اور پسرزادے بھی اور لے لیانو اور آرکادیو کے بچپن کے ساتھی تھے اور ربیکا و امارانتا کے ساتھ کشیدہ کاری کرنے کے لئے گھر میں صرف انہیں کی بیٹیوں کا آنا جانا تھا۔ نیکوکارڈان اپولینار کا سکوتے، جن کا کام اپنے ناکافی وسائل سے دولٹھیت سپاہیوں کو برقرار رکھنے تک محدود ہوکر رہ گیا تھا، محض نام کے ایڈمنسٹریٹر تھے، گھر کے خرچ میں مدد کرنے کے لئے ان کی بیٹیوں نے سلائی کی دوکان کھول لی تھی جہاں وہ نمدے کے پھول اور امرود کی برفی بیچتی تھیں اور فرمائشی محبت نامے بھی لیکن خوش مزاج، سلیقہ مند، نئے ڈانسوں میں بیحد ماہر اور شہر کی سب سے خوبصورت لڑکیاں ہونے کے باوجود وہ دعوت میں مدعو کئے جانے سے محروم رہیں۔

جب ارسلا اور فرنیچر کے ڈبے کھولنے، چاندی کے برتن چمکانے اور گلاب کے پھولوں سے لدی ناؤں میں بیٹھی لڑکیوں کی تصویریں آویزاں کر کے مستریوں کی بنائی سپاٹ دیواروں میں نئی زندگی بھرنے میں لگی تھیں، کھوسے آرکادیو بوئن دیا نے خدا کے عدم وجود کے تئیں مطمئن ہوکر اس کی شبیہ کی تلاش چھوڑ دی تھی اور پیانولا کے طلسمی راز کو منقطع کرنے کے مقصد سے اس کے حصے الگ الگ کر دئے تھے۔ دعوت سے دو دن پہلے، بچی ہوئی کنجیوں اور کیلوں کی پھوار میں تر بتر، ایک سرے سے کھلتے تو دوسرے سرے سے پھر لپٹے تاروں کے جال میں الجھے، انہوں نے جیسے تیسے آلہ کو ازسرنو منضبط کیا۔ اتنی بے چینی اور اتنی بھاگ دوڑ کبھی نہ ہوئی جیسی ان دنوں، لیکن مقررہ وقت اور تاریخ پر الکترا کے نئے چراغ باقاعدہ جل اٹھے۔ ریجن اورنم چونے کی مہک سے بسا گھر کھولا گیا اور ماکوندو کے بنیاد گزاروں کے بچوں اور نائی پوتوں نے پرناگ اور بگونیا سے بھرا برآمدہ، پرسکوت کمرے، گلاب کی مہک سے تر باغیچہ دیکھا اور کمرے میں سفید چادر سے ڈھکے نامعلوم عجوبے کے سامنے جمع ہو گئے جو دلدل کے علاقہ کے دوسرے شہروں میں رائج پیانو سے واقف تھے، وہ کچھ سست سے لگے لیکن سب سے تلخ تھی ارسلا کی مایوسی جب اس نے پہلا رول لگایا کہ امارانتا اور ربیکا ڈانس شروع کریں اور انسٹرومنٹ چلا ہی نہیں۔ نابینا ملکیادیس نے اسے درست کرنے کی کوشش میں اپنی ازکاررفتہ دانشمندی کی مہارت کا سہارا لیا۔ بالآخر کھوسے آرکادیو بوئن دیا، غلطی سے ہی سہی، ایک اٹکا ہوا پرزہ ہلانے میں کامیاب ہوئے اور یکا یک موسیقی پھوٹ پڑی۔ پہلے تیز دھارے میں اور پھر ایک الجھے سُرلہری۔ اتاولے پن کے سبب بنا سلسلہ یا تال میل بٹھائے گئے تاروں پر پڑتی کنجیاں آپے سے باہر ہو گئیں اور ڈانس صبح تک چلتا رہا۔

پیانولا کو درست کرنے کے لئے پی ایترو کرسپی واپس آیا۔ ربیکا اور امارانتا نے تاروں کو سلسلہ وار لگانے میں اس کی مدد کی اور راگوں کی کھلبلی پر اس کے ساتھ ہنسیں۔ وہ اتنا مخلص اور نیک طینت تھا کہ ارسلا نے نگرانی چھوڑ دی۔ اس کی روانگی کی شام مرمت شدہ پیانولا کے ساتھ ایک فوری ڈانس تقریب کا انعقاد ہوا جس میں اس نے ربیکا کے ساتھ جدید ڈانس اسٹائلس کا پُرمہارت مظاہرہ کیا۔ آرکادیو اور امارانتا بھی سلیقہ اور مہارت میں ان سے کم نہ تھے لیکن پروگرام درمیان میں روکنا پڑا کیونکہ دروزے پر لگی تماش بینوں کی بھیڑ میں پیلار تیرنیرا ایک عورت کے ساتھ مار پیٹ کرنے اور بال کھینچنے تک اتر آئی تھی کیونکہ اس نے یہ کہنے کی جرأت کی تھی ارکادیو کا پچھلا حصہ زنانہ لگتا ہے۔ آدھی رات کے قریب پی ایترو کرسپی نے ایک جذباتی تقریر کرتے ہوئے رخصت لی اور بہت جلد واپس آنے کا وعدہ کیا۔ ربیکا دروازے تک اس کے ساتھ گئی اور گھر بند کرنے اور چراغ بجھانے کے بعد اپنے کمرے میں رونے کے لئے چلی گئی۔ یہ ایک ایسا رونا تھا جو کئی دنوں تک جاری رہا اور جس کا سبب امارانتا تک نہ جان پائی۔ اس کا گھنا پن نیا نہ تھا حالانکہ وہ پرخلوص اور خیرسگالی سے پرلگتی تھی پھر بھی اس کا مزاج یک رخا اور دل سمجھ سے پرے تھا۔ وہ ایک شاندار نوخیز حسینہ بن چکی تھی۔ لمبی اور مضبوط ہڈیوں والی، لیکن اب تک وہ اپنے ساتھ لائے اسی چھوٹے سے لکڑی کے جھولے پر بیٹھنے کی ضد کرتی تھی جس کی کئی بار مرمت ہو چکی تھی اور کئی بار ہتھے ٹوٹ چکے تھے۔ کسی کو معلوم نہ تھا کہ اس عمر میں بھی اس کی انگوٹھا چوسنے کی عادت برقرار تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ غسل خانہ کے اندر بند ہونے کا کوئی موقع نہیں چوکتی تھی اور دیوار کی طرف منہ کر کے سونے کی عادی ہو گئی تھی۔ برساتی دوپہر میں بگونیا والے برآمدے میں سہیلیوں کے ساتھ کشیدہ کاری کرتی، وہ باتوں کا سرا کھو بیٹھتی اور باغیچہ میں نم زمین پٹیاں اور کچیوں کی نکالی مٹی کے ڈھیر دیکھ کر ایک آنسو اس کے تالو کو کھارا کر جاتا۔ اس نے پھر سے مٹی کھانا شروع کر

دیا۔ وہ مٹھیاں بھر کر مٹی جیب میں رکھتی اور اپنی سہیلیوں کو کشیدہ کاری کی پیچیدگیاں سمجھاتے ہوئے اور غیر مردوں کا ذکر کرتے ہوئے جو اس تیاگ کے لائق نہ تھے کہ ان کے لئے دیواروں سے چونا کھرچ کر کھایا جائے۔ وہ سیرابی اور غصہ کے ملے جلے جذبے سے چوری چوری، ذرہ ذرہ کھاتی۔ ایک شام بلا سبب ہی آمپارو ماسکوتے نے آکر دیکھنے کی اجازت چاہی۔ اس غیر متوقع انٹرویو سے گڑبڑائی امارانتا و ربیکا اس سے سرد مہری سے پیش آئیں۔ اسے از سر نو تعمیر شدہ مکان دکھایا۔ پیانولا پر راگ سنوائے اور بسکٹ و سنترے کا رس پیش کیا۔ امپارو نے وقار، شرافت اور سلیقہ کا سبق دیا جس سے ارسلا بہت متاثر ہوئی۔ دو گھنٹے کے بعد جب گفتگو ست ہوگئی، امرانتا کی عدم توجہی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے آمپارو نے ربیکا کو ایک خط دے دیا۔ وہ عزت مآب آنسہ ربیکا بوائن دیا کا نام دیکھ سکی۔ اسی منظم تحریر، اسی ہری روشنائی اور لفظوں کی اسی نزاکت سے لکھا ہوا جس سے پیانولا کے چلانے سے متعلق ہدایتیں لکھی تھیں اور اس نے انگلیوں کے سروں سے اسے موڑ کر، آمپارو ماسکوتے کو بے پناہ ممنویت کے ساتھ دیکھتے ہوئے خط کو انگلیوں میں چھپالیا۔

آمپارو ماسکوتے اور ربیکا بوائن دیا کی دوستی نے اور یلیانو کی امیدیں جگا دیں۔ ننھی ریمید یوس کی یاد نے اسے رنجیدہ کرنا نہ چھوڑا تھا لیکن اس سے مل پانے کا اتفاق نہ ہوا۔ جب وہ اپنے قریبی دوستو ماگنی فکو ویبال اور کھیر یلیند و مارکیز کے ساتھ جوانہی ناموں والے ماکوندو کے بانیوں کے بیٹے تھے۔ شہر میں سیر کرتا تو سلائی کی دوکان میں بے چین نگاہ سے اسے ڈھونڈتا لیکن اسے بڑی بہنیں دکھائی دیتیں۔ گھر میں آمپارو ماسکوتے کی موجودگی جیسے ایک پیشگی اطلاع تھی۔

'وہ اس کے ساتھ آئے گی۔' وہ اپنے آپ سے دھیمے دھیمے کہتا، 'وہ آئے گی' اس نے یہ اتنی بار دہرایا ہوگا اور اتنی امید کے ساتھ کہ ایک دوپہر جب وہ تجربہ گاہ میں سونے کی چھوٹی سی مچھلی کے حصے جوڑ رہا تھا، اسے بلا شبہ لگا کہ وہ اس کی پکار کا جواب دے رہی ہے۔ کچھ عرصہ بعد یقیناً اسے وہ معصوم آواز سنائی دی اور نظر اوپر کی تو گلابی اور گنڈی کی پوشاک اور سفید جوتیاں پہنے دروازے پر کھڑی لڑکی کو دیکھ کر اس کا دل دہشت سے منجمد ہوگیا۔

'اندر نہ جانا، ریمید یوس' امپارو ماسکوتے کمرے سے بولے، 'وہ کام کر رہے ہیں۔' لیکن اور یلیانو نے اسے جواب دینے کا وقت نہیں دیا۔ اس نے سونے کی مچھلی کو اس کے منھ سے نکلتی زنجیر سے پکڑ کر اوپر اٹھایا اور بولا، 'اندر آؤ۔'

ریمید یوس اندر آئی اور مچھلی کے بارے میں کچھ سوالات کئے لیکن اچانک دمہ کا دورہ پڑ جانے سے اور یلیانو جواب نہ دے پایا۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس نرم جلد کے قریب ان پتّے کی آنکھوں کے قریب رہنا چاہتا تھا، اس آواز کے بیحد قریب، جو ہر سوال پر اسے 'جی' کہہ کر والد کی طرح احترام سے جواب دے رہی تھی۔ میلکیادیس کونے میں میز پر بیٹھا تھا۔ اس لمحہ اور یلیانو میں اس کے تئیں بے پناہ حسد پیدا ہوئی۔ وہ کچھ نہ کر سکا، بس ریمید یو سے صرف اتنا کہہ سکا کہ وہ اسے سونے کی مچھلی تحفہ میں دینے والا ہے۔ بچی اس تجویز سے اتنا چونکی کہ جتنی جلدی ممکن ہو سکا تجربہ گاہ سے باہر نکل آئی۔ اس دوپہر اور یلیانو وہ تحمل کھو بیٹھا جس سے اس نے ریمید یوس سے ملنے کے موقع پر اتنا انتظار کیا تھا۔ کام سے دلچسپی ہٹ گئی۔ ذہن کو مرتکز کرنے کی ناکام کوششوں میں اس نے اس کے آنے کا انتظار کیا لیکن ریمید یوس نہ آئی۔ اور یلیانو نے اسے ہر جگہ تلاش کیا، اس کی بہنوں کی دوکان میں، اس کے گھر کی کھڑکیوں کے پیچھے، اس کے والد کے دفتر میں، لیکن اسے پایا تو محض اس شبہ میں جس سے اس کے اندرون کی تنہائی شرابور تھی۔ وہ کمرے میں ربیکا کے ساتھ پیانولا کے والٹز سنتے کئی کئی گھنٹے گزارنے لگا۔ وہ اس لئے سنتی تھی کیونکہ یہی وہ دھنیں تھیں جن پر پی ایتر وکرپسی نے اسے ڈانس سکھایا تھا۔ اور یلیانو محض اس لئے سنتا کیونکہ ہر چیز، موسیقی بھی، اسے ریمید یوس کی یاد دلاتی۔

گھر پیار سے بھر گیا۔ اور یلیانو اسے اشعار میں ظاہر کرتا جن کا نہ آغاز تھا نہ انجام۔ انہیں وہ ملکیادیس کے دئے گئے سخت چرمی کاغذ پر لکھتا، غسل خانہ کی دیواروں پر، اپنے بازوؤں کی جلد پر، اور ریمید یوس مجسم نظر آتی: دوپہر کے دو بجے کی خمار آلود ہوا میں ریمید یوس، گلابوں کی چھپی سانس میں ریمید یوس، پتنگوں کی حرکات و سکنات میں ریمید یوس، صبح کی ڈبل روٹی کی بھاپ میں ریمید یوس، ہر جگہ ریمید یوس اور سدا کے لئے ریمید یوس۔ ربیکا کھڑکی کے قریب کشیدہ کاری کرتی ہوئی شام کے چار بجے پیار کا انتظار کرتی۔ اسے معلوم تھا کہ ڈاکیہ کا خچر پندرہ دن میں ایک ہی بار آتا تھا لیکن وہ روز انتظار کرتی۔ اس یقین میں کہ وہ غلطی سے کسی اور دن بھی آسکتا ہے۔ ہوا الٹا ہی، ایک بار خچر مقررہ دن پر نہیں آیا۔ مایوسی کے عالم میں ربیکا نصف رات میں اٹھی اور درد و غصے کے آنسو پیتے، نرم کینچوے چباتے اور گھونگھے پر دانت کچکچاتے، خودکش انداز سے باغیچہ میں مٹھیاں بھر بھر کر مٹی کھا گئی۔ صبح ہونے تک الٹیاں کیں اور بخار میں تپ کر بے سدھ ہوگئی۔ حیران ارسلا نے اس کے صندوق کا تالا توڑا اور نیچے اسے ملے گلابی فیتوں سے بندھے معطر سولہ خطوط اور پرانی کتابوں میں محفوظ پتوں کا ورق پنکھڑیوں کے ڈھانچے اور خستہ سوکھی تتلیاں۔

صرف اور یلیانو ویرانی کی اس انتہا کو سمجھ سکنے کا اہل تھا۔ اس دوپہر جب ارسلا ربیکا کو بیخودی کے دلدل سے نکالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ ماگنی فیکو بسوال اور خیر ینیلد و مارکیز کے ساتھ کاتارینو کی

دوکان گیا۔ اب وہاں لکڑی کے کمروں کی گیلری بڑھا دی گئی تھی جس میں مرجھائے پھولوں کی بو لئے تنہا عورتیں رہا کرتی تھیں۔ ایکارڈئین اور ڈھول والوں کی ایک ٹولی عظیم فرانسسکو کے گیت بجا رہی تھی جسے کئی برسوں سے ماکوندو اور خیر بنیلد و اور یلیانو کے ہم عصر تھے لیکن دنیاوی معاملوں میں زیادہ تجربہ کار، انہوں نے عورتوں کو گود میں بٹھا کر باقاعدہ پی، دانتوں میں سونے کے کام والی ایک کملائی سی عورت نے اور یلیانو کو اس طرح چھوا تو وہ تھرتھرا گیا۔ اس نے عورت کو پرے کر دیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ وہ جتنا زیادہ پی رہا تھا اتنا ہی زیادہ ریمیدیوس کو یاد کر رہا تھا لیکن یادوں کا کرب بہتر طور سے جھیل پا رہا تھا اور اسے کچھ پتہ نہ چلا، وہ کب ہوا میں تیرنے لگا۔ اسے اپنے دوست اور وہ عورتیں ایک پر جوش روشنی میں تیرتے نظر آئے۔ غیر مجسم اور بے وزن، وہ الفاظ کہتے جو ان کے منھ سے نہیں نکل رہے تھے اور ایسی پُراسرار علامتیں بناتے جو ان کے ہاؤ بھاؤ سے میل نہیں کھاتے تھے۔ کاتارینو نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور بولا 'گیارہ بجنے کو آئے ہیں۔ اور یلیانو نے اپنا سر گھمایا، وہ بے ڈول اور بدصورت چہرہ دیکھا جس کے کان کے پیچھے نمدے کا پھول لگا تھا اور پھر وہ یادداشت کھو بیٹھا جیسا عدم یادداشت کے دنوں میں ہوا تھا اور پھر یادداشت پائی تو ایک بیگانی صبح اور ایک اجنبی کمرے میں جہاں پیلار تیرنیرا ایک جھینی پوشاک پہنے کھڑی تھی، ننگے پاؤں، کھلے بال، اسے لیمپ کی روشنی میں دیکھتے، عدم اعتماد سے متحیر۔'

'اور یلیانو!'

اور یلیانو نے پیر جمائے اور سر اٹھایا۔ وہ نہیں جانتا تھا، وہ وہاں کیسے پہنچا۔ لیکن وہاں پہنچنے کا مقصد جانتا تھا جو وہ اپنے دل کے کسی حصے میں بچپن سے چھپائے آیا تھا۔

'میں تمہارے ساتھ سونے آیا ہوں۔'

اس کے کپڑے کیچڑ اور قے سے تر بتر تھے۔ پیلار تیرنیرا نے جو اس وقت اپنے دو چھوٹے بچوں کے ساتھ اکیلی رہتی تھی، کوئی سوال نہ کیا۔ اسے بستر پر لے گئی۔ گیلے کپڑے سے اس کا منھ پوچھا، اسکے کپڑے اتارے اور پھر خود پوری طرح سے برہنہ ہوگئی اور مچھر دانی نیچے گرا دی تاکہ اگر بچے جاگیں تو انہیں دیکھ نہ سکیں۔ وہ تھک گئی تھی، اس مرد کا انتظار کرتے کرتے جو رہ گیا، ان کا جو چلے گئے، ان بے شمار مردوں کا جو تاش کے پتوں کی طرح بے یقینی سے مشکوک اس کے گھر کا راستہ بھول بیٹھے۔ انتظار کے اس عرصہ میں اس کی جلد میں جھریاں پڑ گئی تھیں، پستان کملا گئے تھے اور دل کے انگارے بجھ گئے تھے۔ اس نے اندھیرے میں اور یلیانو کو ٹٹولا، اپنا ہاتھ اس کے پیٹ پر رکھا اور مادرانہ شفقت سے گردن پر بوسہ دیا۔ 'میرا بچہ' وہ پھسپھسائی۔ اور یلیانو کانپ گیا۔ پُرسکوت مہارت سے بناچوکے اس نے دکھوں کے پہاڑ پس پشت ڈالے اور ریمیدیوس کو جانوروں اور دھلے کپڑوں کی مہک لئے ایک بے پناہ دلدل میں بدلا پایا۔ جب وہ اس سے باہر آیا تو رو رہا تھا۔ شروع میں کچھ ٹوٹی سسکیاں تھیں۔ پھر ایک بے پناہ گریہ۔ جیسے کوئی آبلہ اس کے اندر پھٹ گیا ہو۔ وہ رکی رہی، اپنی انگلیوں سے اس کا سر سہلاتی رہی جب تک اس کا جسم اس کے کسیلے سیال سے آزاد نہ ہوگیا جو اسے جینے نہیں دے رہا تھا۔ تب پیلار تیرنیرا نے اس سے پوچھا: 'کون ہے وہ؟' اور اور یلیانو نے اسے بتا دیا۔ پیلار تیرنیرا کی ہنسی چھوٹ گیا۔ ایسی ہنسی جس سے گزرے زمانے میں فاختائیں ڈر جایا کرتی تھیں اور جو اَب بچوں کی نیند بھی نہ توڑ سکی۔ 'تمہیں پہلے اسے پال پوس کر بڑا کرنا ہوگا' اس نے مذاق میں کہا لیکن مذاق کی پرت کے نیچے اور یلیانو نے ہمدردی کا خزانہ پایا۔ جب وہ کمرے سے باہر آیا۔ نہ صرف اپنی مردانگی کے تئیں اپنے شبہات کو پیچھے چھوڑتے ہوئے بلکہ اس تلخ بوجھ کو بھی وہ جو اپنے دل میں اتنے مہینوں میں سے ڈھوتا آیا تھا، پیلار تیرنیرا نے اس سے وعدہ کیا۔

'میں لڑکی سے بات کروں گی۔' وہ بولی، 'اور تم دیکھنا میں اسے طشتری میں سجا کر تمہیں پیش کروں گی۔'

اس نے وعدہ پورا کیا لیکن برے وقت میں کیونکہ گھر میں اب پہلا سا سکون نہیں تھا۔ ربیکا کے غصے کا احساس ہونے پر جسے اس کی چیخوں کی وجہ سے اب چھپائے رکھنا ممکن نہ تھا، امارانتا کو تیز بخار چڑھ آیا۔ وہ بھی یکطرفہ محبت کے کانٹے سے زخمی تھی۔ غسل خانہ میں بند، ناامیدی سے پر محبت کے دکھ سے آزاد ہونے کے لئے وہ تپش سے بھرے خط لکھتی جنہیں بالآخر اپنے صندوق کی تلی میں چھپا دیتی۔ ارسلا بمشکل دو بیمار بیٹیوں کی دیکھ بھال کی طاقت مجتمع کر پا رہی تھی۔ لمبی چانچ پڑتال کے بعد بھی وہ امارانتا کے عندیہ کے اسباب کا پتہ لگانے میں ناکام رہی۔ بالآخر اس نے صندوق کا تالا توڑا اور وہاں اسے ملے گلابی فیتے سے بندھے تازہ کنول کے پھولوں کے تر بتر اور آنسوؤں سے نم، پی ایتو کرپسی کو مخاطب کبھی نہ بھیجے گئے وہ خطوط غصے سے پاگل ارسلا اس لمحہ کو کوسنے لگی جب اسے پیانولا خریدنے کا فتور سوار ہوا تھا۔ اس نے کشیدہ کاری کی کلاس پر پابندی لگا دی اور کسی کے انتقال کے بغیر ہی ایک ایسے ماتم کی اطلاع دے ڈالی جو تب تک قائم رہنا تھا جب تک کہ بیٹیاں امید نہ کھو بیٹھیں۔ کھوسے آرکادیو بوئن دیا نے پی ایتو کرپسی کے بارے میں اپنا پہلا نظریہ تبدیل کر لیا تھا اور آلات موسیقی کے استعمال میں اس کی مہارت کا احترام کرنے لگا تھا لیکن ان کی دخل اندازی بیکار رہی۔ یہی سبب تھا کہ جب پیلار تیرنیرا نے اور یلیانو کو بتایا کہ ریمیدیوس بیاہ کے لئے راضی ہوگئی ہے، اسے پتہ تھا کہ یہ خبر اس کے ماں باپ کو اور بے چین کر دے گی لیکن اس نے صورت حال کا سامنا کیا۔ کمرے میں ایک رسمی ملاقات کے لئے مدعو کھوسے آرکادیو بوئن دیا اور ارسلا نے بیٹے کے

اعلان کو حیرانی کے ساتھ سنا۔لیکن منگیتر کا نام جاننے پر کھوسے آرکادیو بوئن دیا غصے سے آگ ببولہ ہو گئے۔ ایک بلا ہے پیار، وہ گرجے 'اتنی ساری خوبصورت اور سلیقہ مند لڑکیوں کے آس پاس ہوتے ہوئے تمہیں بس دشمن کی بیٹی سے بیاہ رچانے کی سوجھی ہے۔' لیکن ارسلا اس پسند سے راضی تھی۔ اس نے ساتوں ماسکوتے بہنوں، ان کے حسن، کام کرنے کی ان کی توانائی اور ان کے اچھے رویئے کے تئیں اپنا دلار تسلیم کیا اور اپنے بیٹے کی خود اعتمادی کی داد دی۔ بیوی کے جوش کے قائل کھوسے آرکادیو بوئن دیا نے پھر ایک شرط لگائی: ریبیکا جسے وہ چاہتا تھا، پی ایتر وکرپسی کی منگیتر ہوگی۔ وقت ملتے ہی ارسلا امارانتا کا من ہلکا ہو سکے۔ راضی نامے کی خبر لگتے ہی ریبیکا ٹھیک ہوگئی اور اپنے منگیتر کو ایک پر مسرت خط لکھ ڈالا جسے ماں باپ کی منظوری کے بعد بغیر کسی بچولئے کا سہارا لئے اس نے خود ڈاک میں ڈالا۔ امارانتا نے فیصلے سے رضامندی دکھائی اور دھیرے دھیرے بخار سے آزاد ہوگئی لیکن اس نے من ہی من اپنے آپ سے وعدہ کیا کہ ریبیکا کا بیاہ ہوگا تو اس کی لاش پر۔

اگلے سنیچر کھوسے آرکادیو بوئن دیا نے اپنا گہرے رنگ کا اونی سوٹ، سیلولائڈ کا کالر اور ہرن کی کھال کے جوتے پہنے جو انہوں نے پہلی بار عشائیہ کی رات پہنے تھے اور ریمیدیوس ماسکو نے ہاتھ مانگنے گئے۔ جج اور ان کی بیوی نے مستر اور تفکر کے ساتھ ان کا خیر مقدم کیا کیونکہ وہ اس غیر متوقع انٹرویو کے انعقاد سے ناواقف تھے اور پھر انہیں یہ بھی لگا کہ وہ مطلوبہ بہو کے نام میں غلطی کر رہے ہیں۔ غلطی دور کرنے کے خیال سے ماں نے ریمیدیوس کو جگایا اور اسے بانہوں میں اٹھا کر کمرے میں لائی۔ اس سے پوچھا گیا کہ کیا وہ واقعی بیاہ کرنے پر قائم ہے اور اسنے رریاتے ہوئے جواب دیا کہ وہ تو بس یہ چاہتی ہے کہ وہ اسے سونے دیں۔ ماسکوتے نے کپل کی حیرانی کا اندازہ لگاتے ہوئے کھوسے آرکادیو بوئن دیا اور یلیانو سے معاملہ صاف کرنے گئے۔ جب وہ واپس آئے، ماسکوتے کپل نے رسمی لباس پہن لئے تھے۔ کرسی میز وغیرہ کی جگہ تبدیل کر دی تھی اور پھولدانوں میں نئے پھول لگا دئے تھے اور اپنی بڑی بیٹیوں کے لئے ان کا انتظار کر رہے تھے۔ سیلولائڈ کے کالر کے جھنجھٹ سے بوجھل کھوسے آرکادیو بوئن دیا نے اس بات کی تصدیق کی کہ درحقیقت ریمیدیوس ہی مطلوب تھی۔ 'یہ کوئی تک نہیں بنتا' ڈان اپولنار ماسکو نے تعجب سے کہا، 'ہماری چھ اور بیٹیاں ہیں، سب کنواری اور سب شادی کے لائق ہیں جو آپ کے سنجیدہ اور محنتی جوان بیٹے کی بیوی بننے میں بے پناہ خوشی محسوس کریں گی اور اور یلیتو کی نظر پڑی تو اس پر جو ابھی بستر میں ہی پیشاب کرتی ہے۔' ان کی بیوی ستائی ہوئی سی پلکوں والی اس عورت نے اس بدتہذیبی پر شوہر کو پھٹکارا۔ جب انہوں نے پھلوں کا رس پی کر ختم کیا، شوہر بیوی دونوں اور یلیانو کے فیصلے کو بخوشی تسلیم کر چکے تھے۔ بس مسز ماسکوتے نے ارسلا سے تنہائی میں بات کرنے کے موقع کی درخواست کی۔ تعجب سے پر، یہ اعتراض کرتے ہوئے کہ اسے آدمیوں کے معاملوں میں بیچ میں لایا کیوں جا رہا ہے لیکن درحقیقت جذبات سے مغلوب، ارسلا اگلے دن ان سے ملاقات کرنے گئی۔ نصف گھنٹے کے بعد وہ اس خبر کے ساتھ واپس آئی کہ ریمیدیوس کی جوانی کا آغاز ابھی نہیں ہوا تھا۔ اور یلیانو کو یہ کوئی خاص رخنہ محسوس نہیں ہوا۔ اس نے اتنا انتظار کر لیا تھا کہ اسے اپنی منگیتر کے حمل ٹھہرنے کی عمر تک پہنچنے کے لئے ضروری انتظار کرنا منظور تھا۔

نئے مثبت حالات میں صرف ملکیادیس کے انتقال سے رخنہ پڑا۔ یہ ایک متوقع سانحہ تھا، حالانکہ اس کے حالات نہیں تھے۔ واپس آنے کے کچھ مہینے بعد اس میں ضعیفی کا ایسا عمل گھر کر گیا جو اتنا تیز اور تکلیف دہ تھا کہ جلد ہی اسے ان بیکار بوڑھوں کی طرح سمجھا جانے لگا جو پیر گھسیٹتے، اونچی آواز میں بہتر زمانے کو یاد کرتے، بیڈروم میں سائے کی طرح ہلتے جلتے رہتے، جن کی نہ کوئی پروا کرتا ہے اور جو درحقیقت نہ کسی کی یاد میں رہے ہیں جب تک کہ کسی صبح بستر پر مردہ نہ ملیں۔ شروع شروع میں داگیورٹائپ کا نیا پن اور ناسٹرڈ کی پیشینگوئیوں سے حوصلہ پا کر کھوسے آرکادیو بوئن دیا اس کے کام میں اس کا ہاتھ بٹاتے رہے لیکن دھیرے دھیرے وہ اسے اس کے اکیلے پن کے ساتھ چھوڑتے گئے کیونکہ اب اس کا ساتھ مسلسل مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ اس کا دیکھنا اور سننا کم ہو گیا تھا۔ بات کرنے والوں کو وہ انسانیت کے دور دراز زمانوں میں جانے گئے کہیں اور افراد سے جوڑ بیٹھتا تھا اور سوالوں کا جواب کئی زبانوں کی ملی جلی پیچیدہ کھچڑی میں دینے لگا تھا۔

ایک دن وہ اپنے نقلی دانت لگانا بھول گیا جو اس نے گزشتہ رات پلنگ کے نزدیک ایک پانی کے چھوٹے گلاس میں رکھ چھوڑے تھے، انہیں اس نے پھر کبھی نہیں لگایا۔ جب ارسلا نے گھر کی توسیع کا کام شروع کیا تو خاص اس کے لئے اور یلیانو کی تجربہ گاہ سے ملحق ایک کمرہ بنوایا، گھر کی ہلچل اور شور شرابے سے دور، روشنی سے پُر کھڑکی اور ایک کتب خانے کے ساتھ اس نے خود گرد و غبار اور کیڑوں سے تقریباً برباد ہوتی کتابیں اور نایاب رسم الخط کے خستہ کاغذ ترتیب سے لگائے اور ان کے ساتھ نقلی دانت والا پانی کا گلاس رکھا جس میں ننھے پیلے پھولوں والی کچھ آبی گھاس پھوس اگ آئی تھی۔ نئی جگہ جیسے، ملکیادیسکو راس آ گئی کیونکہ وہ پھر کہیں اور نہیں دکھائی دیا، کھانے کے کمرے میں بھی نہیں، جاتا تو بس اور یلیانو کی تجربہ گاہ میں جہاں وہ گھنٹوں بیٹھے بیٹھے ان چرمی کاغذوں پر اپنا پر اسرار ادب لکھتا رہتا جسے وہ اپنے ساتھ لایا تھا اور جو سون پاپڑی کی طرح بھربھرا جانے والے کسی خشک عنصر کے بنے محسوس ہوتے تھے۔ وہیں پر وہ ویجیتا سیون کا دن میں دو بار لایا ہوا کھانا کھاتا تھا۔ جلد ہی اس نے وہ

جسامت حاصل کر لی جو سبزی خوروں میں اکثر دیکھنے کو مل جاتی ہے۔ جلد پر ایک باریک کائی اگ آئی، کچھ ویدی ہی جیسی اس کی صدری پر بنی تھی جسے وہ تن سے نہیں اتارتا تھا اور اس کی سانس سے سوتے ہوئے جانور کی مہک آنے لگی۔ شاعری تخلیق کرنے میں محو اور یلیانو بالآخر اسے بھول ہی گیا لیکن ایک بار اسے لگا کہ شاید اسے سمجھ میں آ رہا ہے کہ وہ اپنی پیچیدہ خود کلامی میں کیا کہہ رہا ہے اور اسکی بات پر غور کیا۔ درحقیقت ان سنگلاخ اشعار میں سے جو ایک چیز واضح ہو سکی وہ تھی وشپ وشپ وشپ کی صدی گن گن اور الیکز ینڈر فان ہمبولٹ کا نام آرکادیو کی اس سے کچھ قربت بڑھی جب وہ کیمیا گری میں اور یلیانو کا ہاتھ بٹانے لگا۔ گفتگو کی اس کوشش کے جواب میں میلکیا دیس کبھی کبھی اسپینی میں ایک آدھ جملہ کہہ دیتا جن کی حقیقت سے کوئی خاص سروکار نہ تھا لیکن ایک شام وہ جیسے ایک اتفاقیہ جذبے سے روشن ہو اٹھا۔ کئی سالوں بعد، توپوں کے جتھے کے سامنے، آرکادیو کو وہ جھرجھری یاد آئی تھی جس کے ساتھ میلکیا دیس نے اسے بٹھا کر اپنی ثقیل تحریر کے کئی صفحے سنائے جو ظاہر ہے اس کی سمجھ میں نہیں آئے لیکن جو اونچی آواز میں پڑھے جانے پر پوپ کے ذریعہ نشر شدہ خطوط جیسے محسوس ہوئے۔ پھر وہ کئی دنوں میں پہلی بار مسکرایا اور اسپینی میں بولا، 'جب میں مروں تو میرے کمرے میں تین دنوں تک پارا جلانا' آرکادیو نے یہ کھوسے آرکادیو بوئن دیا کو بتایا جنہوں نے اس معاملے میں اور یقینی جانکاری حاصل کرنا چاہی لیکن صرف ایک ہی جواب پایا، 'مجھے آب حیات مل گیا ہے۔' جب میلکیا دیس کی سانس بو چھوڑنے لگی، آرکادیو اسے ہر جمعرات کی صبح دریا میں غسل کرانے لے جائے گا۔ اس سے وہ بہتر ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ کپڑے اتار کر لڑکوں کے ساتھ پانی میں اترتا اور اس کی پراسرار سمت شناسی اسے گہرے اور خطرناک علاقوں سے بچانے میں کام آتی۔ 'ہم پانی کے پیدا شدہ ہیں۔' ایک بار اس نے کہا۔ اس طرح گھر میں کسی کو اسے دیکھے ہوئے بہت وقت گزر گیا سوائے اس رات کے جب اس نے پیانولا کی مرمت کرنے کی کوشش کی، اور جب وہ جھانواں اور صابن کی ٹکیہ تولئے میں لپیٹے اور انہیں بغل کے نیچے دبائے آرکادیو کے ساتھ ندی پر جاتا تھا۔ ایک جمعرات، ندی جانے کے لئے بلائے جانے سے پہلے آرکادیو نے اسے کہتے سنا، 'میں سنگاپور کے ریت کے ڈھیروں میں بخار سے مر چکا ہوں۔' اس دن وہ پانی میں غلط جگہ اترا اور اگلے دن جا کر ملا، کئی میل دور کہیں نیچے ندی کے ایک موڑ پر، ایک گدھ اس کے پیٹ پر بیٹھا تھا۔ ارسلا کی مایوس کن دلیلوں سے غیر متفق، جو اتنے دکھ کے ساتھ روئی جتنا اپنے والد تک کے لئے نہ روئی تھی۔ کھوسے آرکادیو بوئن دیا نے اسے دفنانے کی مخالفت کی۔ 'وہ لافانی ہے۔' وہ بولے اور خود اس نے ہی اپنے دوبارہ جنم لینے کا فارمولہ ظاہر کیا تھا۔ انہوں نے پانی کی وہ گم گشتہ نلکی نکالی اور ایک پارے کی پتیلی لاش کے پاس ابلنے کے لئے رکھ دی جو آہستہ آہستہ نیلے بلبلوں سے بھرنے لگی۔ ڈان اپولینار ماسکوتے نے انہیں یہ یاد دلانے کی جرأت کی کہ ڈوبنے سے مرا ایک نہ دفنایا جانے والا شخص عوام کی صحت کے لئے خطرہ ہو سکتا ہے۔

'ویسا کچھ نہیں، کیونکہ وہ زندہ ہے۔' یہ تھا کھوسے آرکادیو بوئن کا جواب۔ جنہوں نے جب پارے کے جلنے کے بہتّر گھنٹوں کی تکمیل کی تو متوفی کے جسم میں ایک آسمانی پھول کا ظہور شروع ہو گیا تھا جس کی ترنگوں نے پورے گھر کو ایک خطرناک بھاپ سے تر کر دیا۔ تب جا کر انہوں نے اسے دفنانے کی اجازت دی، یوں ہی کسی بھی طرح نہیں بلکہ ماکوندو کے سب سے عظیم خیر خواہ کے لئے محفوظ، ہر طرح کے احترام کے ساتھ۔ یہ پہلی تدفین تھی جس میں شہر کے سب سے زیادہ لوگ آئے اور جس سے زیادہ دھوم دھام شاید ایک صدی بعد بڑی ماں کی تدفین میں ہی دیکھی گئی ہوگی۔ اسے قبرستان کے لئے مقررہ زمین کے ٹھیک درمیان میں کھودی گئی قبر میں دفنایا گیا، ایک لوح مزاح کے ساتھ جس میں اس کے بارے میں ایک معلوم واحد اطلاع لکھ دی گئی: میلکیا دیس۔ اسے اس کے نوجگراتے دئے گئے۔ کافی پینے، لطیفے سنانے اور تاش کھیلنے کے لئے آنگن میں لگے جمگھٹ کے دوران امارانتا کو موقع ملا کہ وہ پی ایتزو کرپسی سے اپنے پیار کا اظہار کرے جس نے ابھی کچھ ہفتے ہوئے ریبیکا سے شادی طے کر لی تھی اور اسی علاقہ میں موسیقی کے ساز اور آلات کی دوکان لگا لی تھی جہاں کسی زمانے میں گھومتے پھرتے عرب چھٹ پٹ چیزوں کے بدلے میں مکاؤ طوطوں کا سودا کرتے تھے اور جسے اب لوگ ترکوں کی گلی کے نام سے جانتے تھے۔ اطالوی نے، جس کا چمکدار گھنگھرالے بالوں سے بھرا سر عورتوں میں آہ بھرنے کی خواہش جگا دیتا تھا، امارانتا کو ایک سیماب صفت لڑکی ہی سمجھا جو سنجیدگی سے لینے لائق نہ تھی۔

'میرا ایک چھوٹا بھائی ہے۔' وہ اس سے بولا، 'وہ دوکان میں میرا ہاتھ بٹانے آ رہا ہے۔'

امارانتا نے خود کی ہتک محسوس کی اور زہرناک غصے سے پی ایتزو سے کہا کہ وہ اپنی بہن کا بیاہ روکنے کے لئے تیار ہے بھلے ہی اس کے لئے اسے اپنی لاش چوکھٹ پر بچھانی پڑے۔ دھمکی کی ڈرامائیت سے اطالوی اتنا متاثر ہوا کہ ریبیکا کو سب کچھ بتا ڈالنے کے لالچ کو نہ روک سکا۔ اس طرح ارسلا کی مصروفیت کے سبب مسلسل ملتوی کئے جا رہے امارانتا کا سفر ایک ہفتے کے اندر طے ہو گیا۔ امارانتا نے کوئی مزاحمت نہ کی لیکن رخصت ہوتے وقت ریبیکا کو چومتے وقت وہ اس کے کان میں دھیرے سے بولی، 'خواب مت دیکھو۔ خواہ مجھے دھرتی کے اس سرے پر لے جائیں، میں تمہارا بیاہ ہرگز نہیں ہونے دوں گی، چاہے مجھے تمہیں جان سے ہی مارنا پڑے۔'

ارسلا کی غیر موجودگی اور کمروں میں میلکیا دیس

کی مسلسل بے پاؤں چہل قدمی والی غائبانہ موجودگی کی وجہ سے گھر اور بھی بڑا اور خالی محسوس ہونے لگا۔ گھریلو نظام ربیکا کے ذمہ آ گیا تھا جب کہ نانبائی کی دوکان کی دیکھ بھال انڈین آدی واسی کر رہی تھی۔ شام ڈھلے لیونڈر کی ٹھنڈی بہار اور تحفہ میں سدا کوئی کھلونا لئے جب پی ایتروکرپسی آتا، اس کی منگیتر اس سے بڑے کمرے میں ملاقات کرتی جہاں کھڑکیاں اور دروازے کھلے رہتے تھے تاکہ کسی بھی شک کی گنجائش نہ رہے۔ یہ احتیاط قطعی غیر ضروری تھی کیونکہ اطالوی کا رویہ کا اتنا مودبانہ تھا کہ اس نے سال کے اندر اندر اپنی بیوی بننے والی عورت کا ہاتھ تک نہ چھوا تھا۔ ان ملاقاتوں کی وجہ سے گھر نایاب کھلونوں سے بھر گیا۔ چابی کی رقاصائیں، موسیقی کی صندوقچیاں، دلکی چال کے گھوڑے، ڈفلی بجاتے مسخرے، پی ایتروکرپسی کے لائے ہوئے کافی اور تعجب خیز آلات سے کھوسے آرکادیو بوئن دیا کی ملکیادیس کی موت سے پیدا شدہ دکھ کافی ہلکا ہو گیا تھا اور وہ ایک بار پھر کیمیا گری کے اپنے گزرے دور میں واپس ہو گئے۔ ان دنوں وہ پیٹ پھٹے، آنتوں سے عاری جانوروں اور لولک کے اصول پر منحصر لافانی رفتار کے نظام سے انہیں خالص بنانے کی کوشش میں مسلسل آلات کی جنت میں جی رہے تھے۔ ادھر اور یلیانو چھوٹی ریمیدیوس کو پڑھنا لکھنا سکھانے کے لئے تجربہ گاہ کو خیرباد کہہ چکا تھا۔ شروع میں تو بچی کو اپنی گڑیائیں بہت لگتی تھیں بہ نسبت اس آدمی کے جو ہر روز شام کو آجاتا تھا اور اس کا ذمہ دار تھا کہ اسے اس کے کھلونوں سے الگ کر دیا جائے تاکہ اسے نہلا دھلا کر کپڑے پہنا کر مہمان سے ملنے کے لئے کمرے میں بٹھا سکیں لیکن اور یلیانو کے تحمل اور سپردگی نے بالآخر اس کا دل جیت لیا۔ یہاں تک کہ وہ لفظوں کے معنی سیکھنے اور رنگین پنسلوں سے گائے کے باڑوں اور پہاڑوں کے پیچھے سے نکلتے پیلی کرنوں والے سورج کے چھوٹے چھوٹے گھروں کی تصویر اپنی کاپی میں بناتے گھنٹوں ایک ساتھ گزار دیتیں۔

غمزدہ صرف ربیکا تھی۔ امارانتا کی دھمکی کی وجہ سے۔ وہ اپنی بہن کے کیرکٹر، اس کے مغرور رویے سے اچھی طرح واقف تھی اور اس کے غصے کی زہرناکی اسے خوفزدہ کئے ہوئے تھی۔ وہ مٹی نہ کھانے کی تکلیف دہ کوشش کے تئیں پابند عہد غسل خانے میں انگوٹھا چوستے کئی کئی گھنٹے گزار دیتی۔ اپنی فکروں سے راحت کی تلاش میں اس نے پیلا تیرنیرا کو بلا بھیجا تاکہ وہ اس کا مستقبل پڑھ سکے۔ رسمی جھوٹ سچ کے ابتدائی تسلسل کے بعد، پیلا تیرنیرا نے پیشینگوئی کی، 'تم تب تک خوش نہیں رہوگی جب تک تمہارے ماں باپ دفنائے نہیں جائیں گے۔'

'میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔' وہ بولی۔

پیلا تیرنیرا حیران دکھائی دی، 'نہ میری، لیکن تاش کے پتے یہی بتاتے ہیں۔'

ربیکا اس پہیلی سے اتنی پریشان ہوئی کہ یہ سب کھوسے آرکادیو بوئن دیا کے سامنے اگل ڈالا اور انہوں نے اسے تاش کے پتوں کی پیشین گوئی میں یقین کرنے پر خوب ڈانٹا لیکن ساتھ ہی انہوں نے ہڈیوں کا تھیلا ڈھونڈھنے کے لئے الماریوں اور صندوقوں کو چپے چپے چھان مارا اور میز اور کرسیوں اور پلنگ کے گدوں کو ادھر سے ادھر کر ڈالا۔ انہیں یاد آرہا تھا کہ گھر کی تعمیر نو کے بعد انہوں نے تھیلا نہیں دیکھا تھا۔ انہوں نے چپ چاپ مستریوں کو بلوا بھیجا اور ان میں سے ایک نے راز کھولا کہ اس نے تھیلا کسی خواب گاہ کی دیوار میں چن دیا تھا کیونکہ وہ اس کے کام میں رکاوٹ ڈال رہا تھا۔ کئی دنوں تک دیواروں میں کان لگا کر سننے کے بعد آخرکار کڑکڑانے کی گہری آواز محسوس ہوئی۔ دیوار میں چھید کیا گیا اور ہڈیاں ویسی کی ویسی تھیلے میں ملیں۔ اسی دن اسے ملکیادیس کی قبر کے نزدیک ایک بغیر لوح کی قبر میں دفنا دیا گیا اور کھوسے آرکادیو بوئن دیا گھر واپس لوٹے، ایک ایسے بوجھ سے آزاد جو ایک پل کے لئے ان کے اندرون کو اتنا ہی بھاری لگا جیسا پرودینسیو آگیلار کی یادیں۔ باورچی خانے سے گزرتے وقت انہوں نے ربیکا کے ماتھے کو چوما۔

'یہ برے خیال اپنے دماغ سے نکال دو۔' وہ اس سے بولے، 'تم خوش رہوگی۔'

ربیکا کی دوستی کے سبب پیلا تیرنیرا کے لئے گھر کے دروازے پھر سے کھل گئے جو آرکادیو کی پیدائش سے ارسلا نے بند کر دئے تھے۔ وہ دن میں کسی بھی وقت آجاتی، بکریوں کے ریوڑ کی طرح اور مشکل کاموں میں اپنی پرتپش توانائی انڈیل ڈالتی۔ اکثر وہ تجربہ گاہ میں چلی جاتی اور آرکادیو کو اسکے کاموں میں اتنی قوت اور اتنی نرمی سے مدد کرتی کہ وہ بالآخر مشکوک ہو جاتا۔ وہ عورت اسے بے چین کر دیتی تھی۔ اس کی جلد کا چمکدار کتھئی رنگ، اس کی دھوئیں سی مہک، اندھیرے کمرے میں اس کی ہنسی کی ہلچل اس کا ذہن بھٹکا دیتے اور وہ چیزوں سے ٹکراتا پھرتا۔

ایک بار اور یلیانو وہاں اپنی کیمیا گیری کا کام کر رہا تھا اور پیلا تیرنیرا اس کے تحمل کو سراہنے کے لئے میز پر کہنی ٹکا کر جھکی ہوئی تھی کہ اچانک وہ سانحہ رونما ہوا۔ اور یلیانو نے پہلے طے کیا کہ آرکادیو اندھیرے کمرے میں ہے پھر نظر اٹھائی اور اس کی آنکھیں پیلا تیرنیرا کی آنکھوں سے جا ملیں جن میں اس کے دماغ کی بات اس طرح سے صاف دکھائی دے رہی تھی جیسے دوپہر کی دھوپ میں ہو۔

'اچھا،' اور یلیانو نے کہا، 'بتاؤ کیا بات ہے؟'

پیلا تیرنیرا نے ایک پھیکی سی مسکان کے ساتھ اپنا ہونٹ دبایا۔

'یہی کہ تم جنگ کے لئے ٹھیک رہوگے۔' وہ بولی، 'جہاں تک تم نظر جماؤ گے وہیں تمہاری گولی جمے گی۔'

پیشگی مشق کی تصدیق سے اور یلیانو خاموش ہو گیا۔ اس کا دماغ پھر سے کام میں لگ گیا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو اور اس کی آواز نے ایک بے روک طاقت حاصل کر لی۔

'میں اسے پہچان لوں گا۔' وہ بولا، 'وہ میرا نام پائے گا۔'

کھوسے آرکادیو بوئن دیا کو آخر کار وہ مل گیا جو وہ تلاش کر رہے تھے: انہوں نے ایک چابی کی رقاصہ کو گھڑی کی مشین سے جوڑ دیا اور کھلونا اپنی موسیقی کی تال پر تین دن مسلسل بغیر رکے رقص کرتا رہا۔ اس تحقیق نے انہیں اپنے دیگر سرپھرے صنعت کاروں سے کہیں زیادہ متاثر کیا۔ انہوں نے کھانا پینا چھوڑ دیا، سونا چھوڑ دیا۔ ارسلا کی نگرانی اور دیکھ ریکھ کی غیر موجودگی میں ان کی قوت تخئیل انہیں ایک مسلسل بدحواسی کی کیفیت میں کھینچ لے گئی جس سے وہ پھر کبھی نہ باہر آ سکے۔ وہ بیل گاڑیوں، حلوں اور حرکت میں لانے پر استعمال میں آنے والی کسی بھی چیز پر پنڈولم کے اصول نافذ کرنے کا سسٹم تلاش کرنے، رات بھر اونچی آواز میں خود سے باتیں کرتے کمرے میں چہل قدمی کرتے۔ بے خوابی کے بخار نے انہیں اتنا نڈھال کر دیا کہ ایک صبح وہ اپنے کمرے میں آئے پکے بالوں اور غیر یقینی حرکات و سکنات والے ایک بزرگ کو بالکل نہ پہچان سکے۔ وہ پرودینسیو آگالار تھا۔ آخر کار جب وہ اسے پہچانے، حیران کہ متوفی بھی بوڑھے ہوتے ہیں، کھوسے آرکادیو بوئن دیا نے خود کو ماضی سے بے چین پایا۔ 'پرودینسیو' وہ چلائے، 'کتنی دور سے آئے ہو تم!' موت کے کئی سالوں بعد، زندہ لوگوں کے لئے اتنی شدید خواہش تھی، ساتھی کی ضرورت اور اتنی زبردست، موت کے اندر وجود پانے والی اس دوسری موت کی قربت اتنی شدید تھی کہ پرودنسیو آگی لار کو بالآخر اپنے جانی دشمن سے ہی پیار ہو گیا۔ وہ کافی وقت اسے تلاش کرنے میں گزار چکا تھا۔ اس نے رئیوآچا کے متوفیوں سے اس کے بارے میں دریافت کیا، اپار وادی سے آنے والے متوفیوں سے، دلدل کے علاقہ سے آنے والوں سے، لیکن کوئی اسے اس کا ٹھکانہ نہ بتا سکا کیونکہ ماکوندو شہر ملکیا دیس کے آنے اور موت کے کثیر رنگی نقشوں میں اسے ایک مختصر کالے نقطے سے نشانزد کر دینے سے پہلے تک متوفیوں کے لئے غیر متعارف تھا۔ کھوسے آرکادیو بوئن دیا سویرے تک پرودینسیو آگی لار سے باتیں کرتے رہے۔ کچھ گھنٹوں بعد، رات میں جاگنے سے پست، وہ اوریلیانو کی تجربہ گاہ کے اندر آ گئے اور اس سے دریافت کیا، 'آج کون سا دن ہے؟' اوریلیانو نے بتایا کہ منگل 'میں بھی یہی سوچ رہا تھا'، کھوسے آرکادیو بوئن دیا بولے، 'لیکن اچانک مجھے محسوس ہوا کہ شاید سوموار ہی ہے، کل کی طرح، آسمان کو دیکھو، دیواروں کو دیکھو، بگونیا کو دیکھو، کل کی طرح اور اس سے پہلے کے دن کی ہی طرح ہیں۔ آج بھی سوموار ہے۔' ان کی سنک کے عادی اوریلیانو نے ان پر دھیان نہ دیا۔ اگلے دن، بدھ کو کھوسے آرکادیو بوئن دیا پھر تجربہ گاہ میں آئے۔ 'یہ تو لایقینی ہے،' وہ بولے، ہوا کو دیکھو، سورج کی سرسراہٹ سنو، کل اور پرسوں کی طرح آج بھی سوموار ہے۔ اس رات پی ایترو کرسپی نے انہیں برآمدے میں پایا، بوڑھوں کی آہستہ رلائی روتے ہوئے، پرودینسیو آگالار کے لئے، ملکیادیس کے لئے، ریبیکا کے ماں باپ کے لئے، اپنے ماں باپ کے لئے، ان سب کے لئے جنہیں وہ یاد کر سکے اور جو موت کی وجہ سے تنہا تھے۔ اس نے انہیں پچھلے پیروں سے رسی پر چلنے والی چابی کا بھالو تحفہ میں دیا لیکن وہ بھی انہیں اس جنون سے باہر نہ نکال سکا۔ اس نے ان سے پوچھا کہ اس پروجیکٹ کا کیا ہوا جس کی تفصیل انہوں نے اسے کچھ دنوں پہلے بتائی تھی، ایک پنڈولم آلہ بنانے کے امکانات کے بارے میں جو انسان کے اڑان بھر کے کام آ سکے گا، اور انہوں نے جواب دیا کہ یہ ناممکن تھا کیونکہ پنڈولم کسی بھی چیز کو ہوا میں اٹھا سکتا تھا لیکن خود اپنے آپ کو نہیں۔ جمعرات کو ہل چلی مٹی کی سی شکل لئے وہ پھر تجربہ گاہ میں حاضر ہوئے۔

'وقت کا اوزار ٹوٹ گیا ہے۔' وہ تقریباً سسکیاں لیتے ہوئے بولے، 'اور ارسلا اور امارانتا اتنی دور!'

اور یلیانو نے انہیں بچے کی طرح پھٹکارا اور وہ پچھتانے کے انداز میں کھڑے رہے۔ چھ گھنٹے انہوں نے چیزوں کا معائنہ کرتے ہوئے گزارے۔ گزشتہ دن کی ان کی شکل میں کسی طرح کا فرق پانے کی کوشش میں، ان میں کوئی ایسی تبدیلی تلاش کر پانے کی امید میں جو وقت کی رفتار کی علامت ہو۔ پوری رات بستر پر آنکھیں کھولے پڑے رہے۔ پرودنسیو آگالار کو بلاتے ہوئے، ملکیادیس کو، سبھی متوفیوں کو، کہ آ کر ان کا دکھ درد بانٹیں، لیکن کوئی نہیں آیا۔ جمعہ کے روز کسی اور کے جاگنے سے پہلے، انہوں نے دوبارہ مناظر فطرت کا جائزہ لیا، جب تک کہ انہیں کوئی شبہ نہ رہ گیا کہ تب بھی سوموار ہی تھا۔ تب انہوں نے کسی شاندار، گونجنے والی اور برجستہ لیکن پوری طرح سمجھ میں نہ آنے والی زبان میں کسی آسیبی روح کی طرح چلاتے ہوئے اپنی غیر معمولی طاقت کی بربریت سے دروازے کی سلاخ اکھاڑی اور ایلکمی کی تجربہ گاہ داگیورٹائپ کی کوٹھری اور کیمیا گری کے کمرے کا سارا سامان چور چور کر دیا۔ وہ بقیہ گھر کو بھی تہس نہس کرنے والے تھے جب اوریلیانو نے مدد کے لئے پڑوسیوں کو پکارا۔ انہیں قابو میں کرنے کے لئے دس آدمیوں کی ضرورت پڑی، چودہ کی انہیں باندھنے کے لئے، بیس کی انہیں آنگن کے پیڑ تک گھسیٹنے کے لئے جہاں انہیں عجیب وغریب زبان میں بھونکتے اور منھ سے آگ اگلتے ہوئے بندھا چھوڑ دیا گیا۔ جب ارسلا اور امارانتا واپس آئیں وہ بارش میں تر بتر اور پوری معصومیت کے ساتھ ابھی بھی پیڑ سے بندھے تھے۔ دونوں نے ان سے باتیں کیں اور انہوں نے پہچانے بغیر انہیں دیکھا اور کچھ ایسا کہا جو ان کی سمجھ میں نہ آیا۔ ارسلا نے رسی کے کساؤ سے ان کی کلائی اور ٹخنے کھولے اور صرف کمر سے بندھا چھوڑ دیا۔ بعد میں انہیں سورج اور بارش سے بچانے کے لئے ایک چھپر بنوا دیا گیا۔

❑❑❑

ہندی سے اردو ترجمہ 'نجیب انصاری'

گابرئیل گارسیا مارکیز کی دیگر تخلیقات کا مختصر تعارف اور اقتباسات

ہیضے کے دنوں میں محبت (۱۹۸۵ء)

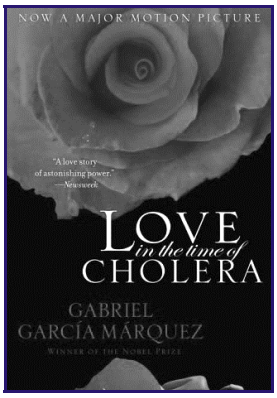

بقول ولیم رو محبت مارکیز کے ناول میں عقل کی دسترس میں نہیں ہے۔ محبت مارکیز کے یہاں ایک طرح کا انتشار کا نام ہے۔ اسی لئے بار بار وہ سماجی پابندیوں کا نشانہ بنتی ہے۔

ہیضے کے دنوں میں محبت، محبت کی کہانی ہے مگر مارکیز نے محبت کو کالرہ یعنی ہیضے دوسرے لفظوں میں ایک خطرناک بیماری سے تعبیر کیا ہے۔ اس ناول میں استعاراتی نظام بڑی مضبوط بنیادوں پر قائم کیا گیا ہے۔ ناول کا مرکزی کردار 'فلورنیتو آریزا' یودی کلون پی لیتا ہے اور گارڈینا کے پھول کھا لیتا ہے۔ اس کے بعد وہ خطرناک الٹیاں کرتا ہے۔ محبت ایک جذباتی اور مہلک بیماری کا نام ہے۔ ہیضے (کالرہ) کو اسپینی زبان میں انسانی غصے اور چڑچڑاہٹ سے بھی تعمیر کیا جاتا ہے۔ ناول کے آخر میں جہاز کا کپتان بھی پلیگ پھیلنے کا اعلان کرتا ہے۔ یہ بھی ایک بلیغ استعارہ ہے اور ناول کے عنوان کو معیناتی استحکام بخشتا ہے۔

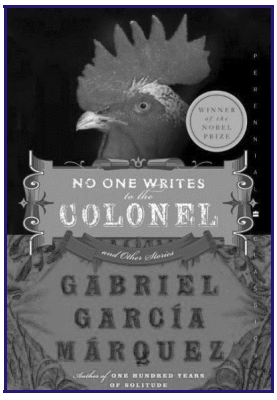

ناول کی کہانی تو بس اتنی سی ہے کہ فلوریتو آریزا نام کا نوجوان فرمینا ڈازا نام کی لڑکی سے محبت کرتا ہے۔ تھوڑی کوشش کے بعد فرمینا ڈازا بھی فلوریتو آریزا کو چاہنے لگتی ہے مگر دونوں آپس میں مل نہیں پاتے ہیں اور سماجی پابندیوں کے تحت الگ کر دئے جاتے ہیں۔ کچھ عرصہ کے بعد فرمینا ڈازا واپس آتی ہے مگر اس نے اپنی شادی کے لئے ایک آخری تاریخ کا تہیہ کر لیا ہے۔ یعنی اس دن جب وہ اکیس سال کی ہو جائے گی۔ فرمینا ڈازا آریزا کی محبت کو ٹھکرا کر جونیل اربینو سے شادی کر لیتی ہے جو ایک ڈاکٹر ہے۔ جونیل اربینو ہیضے کو جڑ سے ختم کرنے کے لئے دن رات کوشاں رہتا ہے۔ جونیل آریزا کے کردار کے ایک دم الٹ ہے۔ جونیل آریزا کی طرح رومانیت کا مارا ہوا نہیں ہے۔ وہ ایک کامیاب اور فرض شناس ڈاکٹر ہے اور انسانی ترقی اور فلاح و بہبودی میں یقین رکھتا ہے مگر وہ مکمل طور پر وفادار شوہر بھی نہیں ہے۔ اس کے کئی عورتوں سے تعلقات رہے ہیں۔ فرمینا کے لئے اس کی محبت روحانی نہیں کہی جا سکتی ہے جیسا کہ آریزا کی فرمینا کے لئے ہے۔ کہانی آگے بڑھتی ہے اور ایک دن جونیل اروینو کی درخت سے گر کر موت واقع ہو جاتی ہے۔ اب آریزا دوبارہ فرمینا سے محبت کی التجا کرتا ہے جو فوراً قبول نہیں کی جاتی ہے مگر آہستہ آہستہ دوبارہ اس کی طرف مائل ہو جاتی ہے۔

ان دونوں کو محبت تو ملتی ہے مگر تب جب وہ بوڑھے ہونے کی کگار پر ہیں۔ ایک بحری جہاز پر ان کے عشق کی تکمیل ہوتی ہے جو ان دونوں کو ماگدالینا میں اوپر کی جانب لے جا رہا ہے۔

مگر یہ محبت کی کوئی جذبات اور سیدھی سی کہانی نہیں ہے۔ مارکیز نے محبت کی علامت کے ذریعہ بہت کچھ کہہ دیا ہے۔ بڑھاپے میں محبت کا ملنا ہی انسانی زندگی پر ایک سماجی (بلکہ سیاسی بھی) تبصرے کی حیثیت رکھتا ہے۔ مارکیز کی کہانی محبت کے اس پار منتظر موت میں بھی مئیر کو مرنے کے وقت کے قریب ہی محبت کے دیدار حاصل ہوتے ہیں۔

ہیضے کے دنوں میں محبت انوکھے انداز کا ناول ہے۔ اس میں مارکیز کی سچی حقیقت نگاری درجۂ کمال کو پہنچتی ہے۔ یہاں ہر شئے کا بیان انسانی وجود کی کسی نئی یا پوشیدہ جہت کو دریافت کرنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ مارکیز کی منفرد حس مزاح یہاں بھی موجود ہے اور ناول کو زیادہ گھنا اور تہہ دار بناتی ہے مثلاً وہ منحوس طوطا جس کو پکڑنے کے لئے جونیل چڑھا تھا یا وہ گڑیا جس پر بدعا لکھی ہوئی ہے وغیرہ۔ اس ناول کو بے اندازہ مقبولیت حاصل ہوئی حالانکہ بہت سے نقاد اس میں جادوئی حقیقت نگاری کو جوڑ توڑ کر کے تلاش کرتے رہے کیونکہ تنہائی کے سو سال شائع ہونے کے بعد اور اسے نوبل پرائز ملنے کے بعد لوگوں کو مارکیز سے اسی انداز بیان کی توقع تھی مگر وہ یہاں تھا ہی نہیں۔ مارکیز اپنے ہر ناول کے اسلوب میں کچھ نہ کچھ تنوع پیدا کرنے کا عادی ہے اور اپنے ناقدوں اور قارئین کو حیران کر دینے کا ہنر اسے بخوبی آتا ہے۔

کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا (۱۹۶۱ء)

اس ناولٹ میں مارکیز نے ایک ایسے کرنل کی کہانی اور زندگی کو پیش کیا ہے جو پہلے ماکاندو میں رہا کرتا تھا لیکن جب وہاں کیلے کی تجارت ایک پاگل پن کی حیثیت اختیار کر گئی تو وہاں سے چلا گیا۔ اب کرنل اپنی پنشن کا انتظار کر رہا ہے جو اسے آخر تک نہیں ملتی۔ کرنل کی بیوی بیمار ہے اور اس کا بیٹا تشدد کے دنوں میں مارا جا چکا ہے۔ انجام کار کرنل گالی دینا سیکھ جاتا ہے۔ ایک دن جب اس کی بیوی پوچھتی ہے کہ ہم کھائیں گے کیا؟ تو کرنل جواب دیتا ہے 'Shit' یعنی 'گو' کرنل محسوس کرتا ہے کہ اس لفظ کو کہنے میں اسے پچھتر برس لگ گئے تھے اور اب یہ جواب دینے کے بعد اس نے اپنے آپ کو مکمل طور پر پاک صاف اور ناقابل تسخیر محسوس کیا تھا۔ ماکاندو اور تنہائی یہاں بھی ایک ایسے پس منظر کا کام کرتے ہیں جسے مارکیز کے اسلوب کی خوش مزاج (Wit) اور برجستگی نے تھوڑا سا دھندھلا کر دیا ہے۔

کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا۔ اس زمانے میں لکھا گیا جب مارکیز کو بھی کافی مشکلات سے سامنا تھا۔ وہ خود بھی ایسے خطوں کے انتظار میں رہتا تھا جن کے ملنے سے اس کی رقم کا بندوبست ہو چکے۔ مارکیز کا یہ ناولٹ زیادہ تر ناشروں نے چھاپنے سے انکار کر دیا۔ پتوں کا طوفان جیسا اہم ناول لکھنے کے باوجود لاطینی امریکہ کا وہ ایک تقریباً گمنام ادیب تھا۔ بہرحال کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا جس ادبی رسالے میں شائع ہوا تو اس کے مدیر نے مارکیز کو کسی قسم کا کوئی معاوضہ نہیں دیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس زمانے میں اخبارات کے وہ شمارے جن میں وہ مضامین لکھ رہا تھا، ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو جاتے تھے۔ مارکیز کی اس ناولٹ میں کہیں کہیں فلم اسکرپٹ کا بھی گمان گزرتا ہے جس کے ذریعہ مارکیز نے کولمبیا کی زندگی کا عکس پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

منحوس وقت (۱۹۶۲ء)

اس ناول کا محل وقوع بھی کریبین کا ساحلی قصبہ ہے جو ایک سیاسی جنگ بندی کی حالت میں گرفتار ہے۔ اس وقت وہاں کوئی خونریزی اور انتشار نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں کے مئیر کو زیادہ سے زیادہ دولت چاہئے۔ اس کے لئے قصبے میں مکمل امن کی موجودگی ضروری ہے مگر آخر کار ایک دن دوبارہ یہ جنگ بندی ختم ہوتی ہے۔ دیواروں پر ایسے پوسٹر لگائے جاتے ہیں جن میں مئیر کے خلاف ہتک آمیز جملے لکھے ہیں۔ خفیہ سیاسی پمفلٹ تقسیم کئے جاتے ہیں۔ مئیر کرفیو لگوا دیتا ہے، گولیاں چلنی شروع ہو جاتی ہیں، اب قصبے کی آبادی کو ایک قسم کی فتح اور طمانیت کا احساس حاصل ہوتا ہے۔

منحوس وقت کو مقامی نقادوں نے پسند کیا اور اسے ایک تیل کمپنی کا جاری کیا ہوا قومی انعام بھی ملا مگر پھر بھی ناول کی بہت کم کاپیاں شائع ہوئی تھیں اور رائلٹی بھی بہت کم رقم کی دی گئی تھی یعنی ابھی ابھی گارسیا مارکیز صرف کولمبیا کا ہی ادیب تھا، کولمبیا کے باہر شاید کوئی اسے ناول نگار کی حیثیت سے نہ جانتا تھا۔

جنرل اپنی بھول بھلیوں میں (۱۹۸۹ء)

مارکیز کے اس ناول کو ہم تاریخی ناول کہہ سکتے ہیں کیونکہ یہ جنرل سائمن حوزے کے کردار پر مبنی ہے جو وسطی امریکہ کی ایک تاریخی شخصیت ہے مگر ایسے ناقدین کی تعداد بھی کم نہیں ہے جو اسے ناول ہی نہیں مانتے مگر اس حوالے سے مشہور ادبی ناقد ڈونالڈ شا کا خیال زیادہ درست معلوم ہوتا ہے جو اس ناول کو جدید تاریخی ناول کا عنوان دیتا ہے کیونکہ اس کا متن بوم، پوسٹ بوم، ماڈرن اور پوسٹ ماڈرن سب کی سرحدوں یا بندشوں کو پار کر جاتا ہے اور ان میں سے کسی بھی ادبی اصطلاح کی گرفت میں نہیں آتا۔ مارکیز نے ناول میں تاریخی حقائق بھی پیش کئے ہیں اور اپنے طور سے واقعات کی تفتیش بھی کی ہے نیز نتائج بھی اخذ کئے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ اس ناول کے شائع ہوتے ہی لاطینی امریکہ میں ایک تنازعہ کھڑا ہو گیا تھا، وینی زیولا کے اور کولمبیا کے بعض سیاست دانوں کو اس بات پر سخت اعتراض تھا کہ مارکیز نے ایک 'سچے

ہیروں' کے کردار کو مسخ کر کے پیش کیا ہے اور اس کی توہین کی ہے مگر برخلاف وسطی امریکہ کے دوسرے ممالک میں ناول کی بہت پذیرائی ہوئی۔ مارکیز کے ہم عصر اور میکسیکو کے سربرآوردہ ناول نگار 'کالوس فیونتیس' نے جنرل کی بھول بھلیوں کو ایک شاہکار قرار دیا۔

ناول کے مرکزی کردار جنرل کو ابتدا ہی میں کارٹیگانا کے سفر پر روانہ دکھایا گیا ہے۔ جنرل ۴۶ سال کی عمر سے تجاوز کر چکا ہے۔ یہ اس کا شاید آخر سفر ہو۔ اسے کارٹیگانا سے یورپ کی جانب مراجعت کر جانا ہے۔ مارکیز نے جنرل کو اس انداز میں پیش کیا ہے کہ وہ لاطینی امریکہ کی تمام سیاسی غلطیوں کا ذمہ دار نظر آتا ہے۔ وہ ایک قسم کا مجرم ہے۔ ایک منفی کردار وہ کمرے میں ننگا گھومتا ہے، قبض اور پیٹ میں اٹھنے والی گیس کا شکار ہے اور گندی گندی گالیاں بکتا رہتا ہے۔ مارکیز نے سائمن بولیویر حوزے کے کردار کو بعض تبدیلیوں کے ساتھ افسانوی انداز میں پیش کیا ہے۔ جنرل آہستہ آہستہ موت کے قریب آرہا ہے۔ چاروں طرف یا تو پلیگ ہے، بارش ہے یا پھر اونگھ ہے۔ کچھ نقاد اس ماحول کو اور اس غنودگی کو جنگ کے مترادف مانتے ہیں تو کچھ اسے تذکیۂ نفس کے وسیلے کے طور پر ایک علامت سمجھتے ہیں۔ یوں دیکھا جائے تو اس پورے ناول کا تھیم ہی اس تاریخ کو رد کرتا ہے جو وسطی امریکہ کے سرکاری مورخوں (ایجنٹوں) نے لکھی ہے اس لئے مارکیز زبانی روایت پر مبنی تاریخ کے تانے بانے سے ناول کے متن کو بنتا ہے۔ یہ کوئی ایسی تخلیق نہیں ہے جس پر آسانی سے پوسٹ ماڈرن یا کسی بھی قسم کا لیبل چسپاں کیا جا سکے۔ مارکیز نے اسے مختلف اسلوب میں لکھا ہے اور اس میں وہ حس مزاح بھی بہت کم ہے جو مارکیز کی تمام تحریروں سے مخصوص ہے۔ یہ اس بڑے اور سچے ادیب کی تحریروں کے تنوع کا بھی ایک ثبوت ہے' جنرل اپنی بھول بھلیوں میں' مارکیز کی تمام تحریروں کے مانند بیحد مقبول و معروف ہوا ہے۔

محبت اور دوسرے آسیب (۱۹۹۴ء)

اس ناول میں مارکیز نے اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کی ہے کہ آخر جادوئی حقیقت نگاری ہے کیا؟ دراصل تنہائی کے سو سال کے نوبل پرائز ملنے کے بعد ادبی اور عملی حلقوں میں اس اصطلاح کے تعلق سے بہت سی بحثیں شروع ہوگئی تھیں۔ یہ پورا ناول اس سوال کے جواب کے بطور پڑھا جانا چاہئے۔ بقول مارکیز ناول اس کی نانی کے ذریعہ سنائی گئی ایک کہانی پر مبنی ہے۔ یہ بات وہ اپنی دوسری تخلیقات کے حوالے سے بھی اکثر کہتا رہتا ہے۔ ناول کی کہانی صرف اتنی سی ہے کہ سروامار یا نام کی ایک لڑکی ہے جسے ایک کتے نے کاٹ لیا ہے، اس کے بعد وہ ایک پراسرار بخار کی زد میں آجاتی ہے، جب وہ ٹھیک ہوجاتی ہے تو اس کے بعد اس میں کچھ ناقابل فہم قوتیں آجاتی ہیں اور قصبے میں عجیب و غریب واقعات ہونے لگتے ہیں۔ لڑکی کو آسیب زدہ سمجھ کر ایک پادری کو سونپ دیا جاتا ہے تاکہ وہ اس کا آسیب اتار سکے مگر المیہ یہ ہے کہ پادری سروامار یا سے جنون کی حد تک محبت میں گرفتار ہوجاتا ہے۔ شاید مارکیز نے محبت کو بھی ایک قسم کا آسیب ہی سمجھا ہے جس طرح ہیضے کے دنوں میں محبت میں محبت کو ایک خطرناک بیماری سے مترادف بھی دکھایا گیا ہے۔ اس ناول کا پلاٹ روایتی قسم ہے مگر کردار بیحد تہہ دار ہیں۔ ہر واقعے کے دو پہلو ہیں۔ ایک پہلو روحانی ہے تو دوسرا منطقی یا عقلی، مارکیز نے قاری کو مکمل آزاد چھوڑ دیا ہے کہ وہ کس پہلو کا اپنے لئے انتخاب کرتا ہے یعنی خود مصنف واقعہ اور اس کے معنی کے غیر مستند ہونے یا غیر یقینی ہونے کا حامی نظر آتا ہے۔ حقیقت کے بارے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اٹھارہویں صدی کے کیتھولک معاشرے کے لئے حقیقت کیا ہے اور دور جدید کے سائنسی مزاج والوں کے نزدیک حقیقت کا کیا تصور ہے، ان دونوں رویوں کا جائزہ لیا گیا ہے اور کہیں مصنف کی مداخلت نہیں ہے۔ اس طرح حقیقت اور جادو کے متعلق دونوں خیالات کا ایک ٹکراؤ یا ملاپ کھل کر سامنے آجاتا ہے۔ اس حوالے سے ناول پر پوسٹ ماڈرن ناول ہونے کا اطلاق ممکن ہے مگر حقیقت تو یہ ہے کہ ناول کے بیانیہ میں جو جادو جاری و ساری ہے اسے کیا نام دیا جائے؟ یہ مارکیز کی ایک اہم اور اعلیٰ تخلیق ہے۔

میری اداس داشتاؤں کی یادیں (۲۰۰۴ء)

۱۹۹۴ء میں محبت اور دوسرے آسیب لکھنے کے بعد گارسیا مارکیز نے اپنے قارئین کو اپنے نئے ناول کے لئے دس سال انتظار کرایا۔ اس درمیانی وقفہ میں مارکیز نے مضامین اور صحافتی نوعیت کی چیزیں ضرور لکھیں جن میں اغوا کی خبریں (۱۹۹۸ء) اور بچوں کے لئے ایک ملک (۱۹۹۸ء) بہت مقبول ہوئیں مگر اس کا نیا تخلیقی کارنامہ ناول کی شکل میں ۲۰۰۴ء میں ہی منظر عام پر آسکا۔ اس ناول کا عنوان ہی چونکا دینے والا ہے۔ اسے ناول کے بجائے ناولٹ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کیونکہ یہ محض ۹۰ صفحات پر مشتمل ہے اور اپنے موضوع نیز تکنیک کے تعلق سے بھی اسے ایک طویل مختصر کہا جائے بہت غلط نہ ہوگا۔

یہ ایک ایسے دانشور صحافی کی داستان ہے جو نوے سال کی عمر خیریت سے گزر جانے کے بعد لمبی عمر حاصل کرنے کے اعزاز میں خود کو ایک تحفہ دینا چاہتا ہے اور وہ تحفہ یہ ہے کہ اس رات وہ کسی کنوری دوشیزہ کے ساتھ عیش کرے۔ اس کی خواہش کی تکمیل کے لئے وہ ایک پرانی طوائف جو غیر قانونی طور پر چکلا چلاتی تھی، کو فون کرتا ہے۔ وہ پرانی طوائف اس کے لئے ایک نوخیز کنواری لڑکی کا انتظام کر دیتی ہے مگر یہ بھی تاکید کر دیتی ہے کہ اگر لڑکی کو سورہی ہو تو اسے اٹھایا نہ جائے۔ ناول کا مرکزی کردار وہ صحافی ایسا ہی کرتا ہے مگر تمام رات لڑکی کو سوتا دیکھتے دیکھتے اچانک اسے لڑکی سے بے پناہ محبت ہوجاتی ہے۔ زندگی میں پہلی بار سچی محبت۔ یہ وہ شخص ہے جو اپنی عمر کے پچاس سال پورے کرتے کرتے ۵۱۴/ عورتوں سے مباشرت کر چکا تھا اور نوے سال کی عمر میں

اب جب موت کبھی بھی اس کا دروازہ کھٹکھٹا سکتی تھی، وہ ایک پندرہ سالہ معصوم لڑکی کی محبت میں گرفتار ہو گیا تھا۔ یہ المناک بھی تھا اور مسرت انگیز بھی اور یہاں اس کے دکھ اور سکھ دونوں ہی روحانی حیثیت اختیار کر چکے تھے۔ اس کے بعد ناول میں ایک معمولی سا ڈرامہ پیش آتا ہے جس میں اس باکرہ کو وہ پرانی گھاگ طوائف کسی گاہک کو پیش کر دیتی ہے۔ اس کے باوجود صحافی کی محبت کم نہیں ہوتی اور پھر ایک سال گزر جانے کے بعد بوڑھے دانشور کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ لڑکی بھی اس سے بے پناہ محبت کرتی ہے۔ اس سے زیادہ اسے کچھ نہیں چاہئے۔ وہ اپنی ہر شئے لڑکی کے نام کر دیتا ہے۔ وہ اب اکیانوے سال کا ہے اور یہی اس کی اصل زندگی ہے۔

میں اپنے افسردہ سے کاغذ دوات اور قاذ کے پروں سے بنے ہوئے قلموں کو درست کر کے قرینے سے لگا رہا تھا کہ اسی وقت سورج پارک میں دھماکے کے ساتھ بادام کے پیڑوں سے نکلتا چلا آیا وہ ڈاک کشتی جو دریا میں چلتی تھی اور سوکھے کے باعث سات دن دیر سے آ رہی تھی، وہ بندرگاہ میں داخل ہوئی اور زور سے طمانیت بھری آواز نکالی تو آخر کار یہی اصل زندگی تھی، اس حال میں کہ میرا دل صحیح وسلامت تھا اور اسے میری سوویں سال گرہ کے بعد کسی بھی دن مسرت سے بھرے کرب میں محبت کی خوشی سے مر جانا تھا۔ یہی اس دل کی سزا تھی۔ ویسے اس میں تو کوئی شک نہیں کہ مارکیز کا یہ پہلا ناول ہے جس میں فور لیٹرس کا استعمال بکثرت ہوا ہے اور جگہ جگہ گراں گزرتا ہے۔ مگر اس کے باوجود یہ مارکیز کی ایک اعلیٰ پائے کی تحقیق ہے کیونکہ مرکزی کردار کی تنہائی کو بیان کرنے کے لئے مصنف نے ایک الگ طریقہ کار کو اپنایا ہے۔ کردار کا رویہ، لوگوں سے اس کا برتاؤ، اس کی نجی زندگی اور جذبات کو مارکیز نے اس انداز میں پیش نہیں کیا جیسا کہ خالص موجودی ادیب کرتے آئے ہیں جیسا کہ عرض کیا گیا ہے کہ ناول میں فور لیٹرز کا بکثرت استعمال گراں گزرتا ہے مگر اس قصہ میں ایک قسم کا بلیک ہیومر شامل کرنے میں معاون بھی ثابت ہوتا ہے۔

مارکیز نے اپنی اداس داشتاؤں کی یادیں کے بعد کوئی نیا ناول نہیں لکھا۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ اب اور ناول نہیں لکھنا چاہتا ہے کیونکہ اب اس کا دل بھر چکا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ اپنے تجربے کے باعث وہ ناول ابھی بھی لکھ سکتا ہے اور اسے اس میں کوئی دشواری نہیں پیش آئے گی مگر لوگ بہ آسانی یہ محسوس کر لیں گے کہ میں نے اسے دل سے نہیں لکھا ہے۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ آخر عمر میں تقریباً چھ سال وہ اپنے جسم میں پلتے اور بڑھتے ہوئے کینسر سے بھی لڑا۔

کسی بڑے ادیب کا ادبی کیریئر ان سب باتوں کا محتاج نہیں ہوتا بھلے ہی مارکیز نے آخر عمر میں خود کو ادبی کاوشوں سے الگ کر لیا ہو لیکن اس کی تخلیقات عالمی ادبی تاریخ کا ایک ناگریز حصہ ہیں۔ وہ ہمارے عہد کا عظیم ترین قصہ گو ادیب ہے۔ اس ادیب کو ہم اس کے ناولوں اور افسانوں کی وجہ سے ہی جانتے ہیں اور یہ آج بھی زندہ ہیں۔ ادبی تخلیق خود کو لکھنا کبھی بند نہیں کرتی، مارکیز کی تخلیقات آج بھی خود کو لکھ رہی ہیں اگرچہ مارکیز لکھنا بند کر چکا ہے۔

❑❑❑

اردو ترجمہ اور پیشکش: خالد جاوید

'نیا دور' مئی ۲۰۱۸ء کے شمارے کی ایک جھلک

آغا حشر کاشمیری کی ڈرامہ نگاری و دیگر خصوصیات پر **زین الدین حیدر**، اردو ادب میں نکڑ ناٹک کی روایت پر **داؤد احمد** اور ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد کی اداریہ نگاری پر **مولانا فضل الرحمن اصلاحی** کے مضامین

سلام بن رزاق، تبسم فاطمہ، سلیم اختر، عبدالصبور قدوائی، گل جبین اختر اور **محمد سلیم** وغیرہ کے افسانے

مناظر عاشق ہرگانوی، افتخار امام صدیقی، سلمیٰ شاہین، راشد جمال فاروقی، ندیم راعی، عالیہ خان، عبرت مچھلی شہری، عبدالقیوم فرقت، کوثر صدیقی اور **اعظم عباس شکیل** وغیرہ کی نظمیں اور غزلیں

اس کے علاوہ ہندوستانی زبانیں، غیر ملکی ادب، گزشتہ لکھنؤ اور دیگر تخلیقات بدستور موجود رہیں گی

نقل مکانی

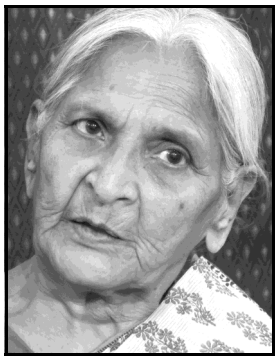

مسرور جہاں

مقبول ومعروف ناول نگار
پچاس سے زائد ناول شائع
دس افسانوی مجموعوں کے ساتھ ساتھ
کئی خاکے بھی شائع
مختلف جرائد میں افسانوں کی اشاعت
وطن فتح پور، بارہ بنکی

پارس ریورویو انکلیو، C-1
مہتاب باغ، حسین آباد، لکھنؤ
رابطہ: 7706954627

اپنے کچے پکے گھر سے اٹھ کر اچانک محل جیسے گھر میں مالکانہ حق کے ساتھ قدم رکھنا کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔ اس سے زیادہ دوسروں کو اس معجزہ کی سچائی پر یقین نہیں آرہا تھا۔ ایسی بات بھی نہیں تھی کہ اس سے پہلے اس نے کبھی بڑے گھر نہیں دیکھے تھے۔ کچا پکا یہ گھر تو ابا نے مجبوری میں بنوایا تھا جو بس گزارنے کے لائق تھا۔ اگر ملازمت کی مجبوری نہ ہوتی تو انہیں اس کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ گاؤں میں ان کے بڑے بڑے دو گھر تھے۔ جہاں دادی رہتی تھیں۔ ایک تو ان کا رہائشی گھر تھا دوسرا بنگلہ تھا جو کہ بالکل نئے طرز کا بنا تھا۔ عمارت کے درمیان میں بڑا ہال تھا۔ ہال کے تین طرف کمرے تھے اور سامنے وسیع برآمدہ تھا اور برآمدہ کے آگے وسیع و عریض صحن تھا جو لان کا کام کرتا تھا۔ بنگلہ عموماً سال بھر خالی پڑا رہتا تھا۔ گرمیوں میں جب اسکولوں اور کالجوں میں تعطیل ہوتی تھی۔ تب دادا مرحوم بنگلہ میں قیام کرتے تھے۔ وہ پروفیسر تھے۔ انہیں کئی زبانوں پر دسترس حاصل تھی، شاعر و ادیب تھے۔ ادب نواز اور دوست نواز بھی تھے۔ گرمیوں کی چھٹی میں دور دور سے ان کے دوست آکر بنگلہ میں قیام کرتے تھے۔ کمروں میں سجی ہوئی الماریوں اور شیلفوں میں ہزاروں نایاب اور قیمتی کتابیں ترتیب سے لگی ہوئی تھیں۔ گیراج میں دادا مرحوم کی آسٹن کھڑی رہتی تھی۔ وہ ریل یا لاری کے بجائے اپنی موٹر میں دور دراز کا سفر کرتے تھے۔ ان دنوں کسی کسی کے پاس اپنی موٹر ہوتی تھی۔

رہائشی مکان خوب کھلا کھلا تھا۔ اس سے ملحق پھلواری تھی۔ پھلواری میں ہی امامباڑہ تھا۔ اسی امامباڑہ میں دادا مرحوم کی قبر بھی تھی۔ کمروں کے پہلو میں بنے ہوئے گول چبوتروں پر کروٹن، الپا کا اور چائنا پام کے گملے سجے رہتے تھے۔ داخلی دروازے کے پہلو میں بام کے اونچے اونچے پیڑ ایستادہ تھے۔ چہار دیواری کے ساتھ لیمو، انجیر، آم، امرود اور چنے، آڑو کے پیڑ تھے جو اپنی اپنی فصل پر خوب پھلتے تھے۔ کیاریوں میں گلاب، بیلا، کامنی اور رات کی رانی کے پودے لگے تھے۔ ابا اپنے والدین کی اکلوتی اولاد نرینہ تھے لیکن خدا جانے کیا بات تھی کہ اس نے دل سے ان گھروں کو کبھی ابا کا گھر نہیں سمجھا۔ ہمیشہ دادا کا گھر کہا اور سمجھا بھی۔ اس میں شاید ابا کی درویشانہ طبیعت کا زیادہ دخل تھا۔ بس وہ کچا پکا گھر ہی اسے اپنا اپنا سا لگتا تھا کیونکہ وہاں اس کی اماں، ابا اور بھائی بہن رہتے تھے اور اب شادی کے بعد یہ محل جیسا گھر اسے اپنا لگا تھا۔ کیونکہ یہ اس کے شوہر کا گھر تھا۔ وہ اس اس گھر کی مالکن تھی۔ ملکیت کا جذبہ، اپنائیت کا احساس مزید غرور پیدا کر دیتا ہے۔ وہ بھی یہ گھر پا کر مغرور تھی۔

نے گھر کو پیڑ پودوں سے سجایا، سنوارا، پھلوں اور پھولوں کے درخت لگائے۔ فالتو زمین پر سبزیاں اگائیں۔ دیواروں پر ترئی اور سیم کی بیلیں چڑھائیں۔ کمروں کو ضروری فرنیچر سے آراستہ کیا اور جب یہ گھر ایک مکمل مکان کا روپ اور رنگ اختیار کر چکا تو ایک دن شوہر صاحب کو خیال آیا کہ یہ لمبے چوڑے ہال اور وسیع و عریض کمرے جو ہیں وہ دراصل سو سال پرانے بنے ہوئے اصطبل اور شاگرد پیشہ کی بنیادوں پر بنے ہیں۔ ان کی چھتوں کی کڑیاں شہتیر جس دم گھن کھا کر گرنا شروع ہوں گی تو ساری عمارت زمیں بوس ہو جائے گی۔ یہ بم گرانے کے ساتھ ہی اس کے اوپر ہمدردی کا زبردست پچارا بھی پھیرا۔

بیگم! اس وقت ہم نہ ہوئے تو تنہا آپ کیا کریں گی؟ بچے ابھی بہت چھوٹے ہیں۔ ان کی پوری زندگی ہمارے سامنے ہے۔ وہ کیا کہتی؟ البتہ یہ ضرور سوچا کہ ناحق برسوں اس بھرم میں رہی کہ یہ اس کا اپنا گھر ہے اور اس غلط فہمی بلکہ خوش گمانی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دن اسے خالی اس گھر سے نکلنا پڑا۔ پھولوں کے من پسند پودے، سبزی کی کیاریاں، پھلوں کے پیڑ سب اجنبی بن گئے۔ سب نے اس سے آنکھیں پھیر لیں اور وہ خالی دامن خالی ہاتھ رہ گئی۔ اس کے بعد وہ برسوں سفر میں رہی۔ کبھی یہاں کبھی وہاں، راہ میں مختلف اسٹیشن آتے رہے۔ اس نے بھی منزل کی امید نہ چھوڑ دی تھی۔ آخر بنجارے بھی تو جیتے ہی ہیں، وہ بھی جی لے گی۔ جب شوہر کو پہلا ہارٹ اٹیک پڑا تو انہیں خیال آیا کہ ان کے پاس تو مرنے کے لئے اپنا گھر تک نہیں ہے۔ اگر راستے میں مر گئے تو دنیا کیا کہے گی کہ اتنا بڑا رئیس بے گھر، بے در اور بے نام و نشان مر گیا۔ جینے کے لئے نہ سہی، مرنے کے لئے ضرور اپنا گھر ہونا چاہئے۔ نئے گھر کی بنیاد پڑی تو اس نے بھی سکون کا سانس لیا۔ کیونکہ اس بار شوہر نے اسے یقین دلایا تھا کہ یہ اس کا اپنا گھر ہے۔ نقشے سے لے کر بنیاد تک اور بنیاد سے لے کر چھت تک پورا گھر اس کا صرف اس کا ہے۔ اس بھروسے نے تو جیسے اس میں نئی روح پھونک دی۔ اس کی نظر کے سامنے ایک ایک اینٹ جڑتی گئی اور دیواریں انچ انچ کر کے اونچی ہوتی گئیں۔

سلیپ کے لئے سریوں کا جال اس نے اپنے سامنے بنوایا اور جب دیواروں، دروازوں اور چھتوں نے باہم مل کر ایک مکان کی شکل اختیار کر لی تو اسے ایسا لگا کہ پرانا مکان نیا روپ لے کر اس کے سامنے سر اٹھائے کھڑا ہے۔ شوہر صاحب کو احساس تھا کہ اچھا بھلا گھر بیچ کر انہوں نے اس کے ساتھ زیادتی کی ہے جو برسوں گزر جانے کے باوجود آج بھی اپنی پرانی کڑیوں اور شہتیروں کے سہارے مضبوطی سے کھڑا ہے اور شاید اس لئے بالکل اسی نقشے کا مکان بنوا کر انہوں نے اسے تحفتاً دیا تھا۔ وہ بھی اتنی بے مروت نہیں تھی کہ ان کی شکر گزاری سے انحراف کرتی لیکن دل میں کہیں اندر ڈر بھی بیٹھا تھا۔ دنیا کی بے ثباتی کا ذریعہ اپنی بدنصیبی کا خوف کچھ ایسا ضرور تھا کہ وہ پوری طرح خوش نہ ہو سکی لیکن رہنا تو بہرحال وہیں تھا۔ بچوں کی خاطر گھر کو سجایا، سنوارا بھی، پیڑ پودے بھی لگائے اور اپنا دیرینہ خواب بھی پورا کیا۔ ایک الماری میں صرف وہ کتابیں اور رسائل تھے جن میں اس کی کہانیاں چھپی تھیں یا اسکے تحریر کردہ ناول تھے۔ باقی الماریوں میں اس کے پسندیدہ مصنفین کی کتابیں تھیں یا پھر وہ کتابیں جو لکھنے والوں نے اسے تحفتاً دی تھیں اور اسے اپنی جان سے زیادہ عزیز تھیں کیونکہ یہ ان کے خلوص کی آئینہ دار تھیں۔

جیسے جیسے عمر بڑھتی گئی، کتابوں کی تعداد بھی بڑھتی گئی۔ شوہر صاحب کو دوسرا ہارٹ اٹیک ہوا تو وہ جانبر نہ ہو سکے۔ ان کی آنکھ بند ہوتے ہی ان کے عزیزوں نے اس کے اوپر مکان کی ملکیت کے مقدمے دائر کر دئے۔ کچہری کے چکر کاٹتے کاٹتے اس کے سیاہ بالوں میں سفیدی جھلکنے لگی۔ بدن کے گوشت نے ہڈیوں کا ساتھ چھوڑ دیا۔ آنکھوں میں موتیا بند اتر آیا لیکن حالات جیسے کے تیسے ہی رہے بلکہ اور بدتر ہوتے گئے۔ ایک سوال بار بار اس کے ذہن کی دیواروں پر ٹھوکریں مار رہا تھا۔ کیا وہ ترکے میں اپنے بچوں کے لئے بربادی اور پریشانی چھوڑ کر جائے گی؟ یہ تو پرانے رئیسوں کا چلن تھا۔ اس کا قصور صرف اتنا ہے کہ وہ ایک خاندانی رئیس کی بیوہ ہے۔ وہ کہاں کی رئیس زادی ہے۔ لے دے کر ایک مکان ہے وہ بھی مقدموں میں گھرا ہے۔ تب مجبوراً اس نے ایک ایسا فیصلہ کیا جو اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ اس فیصلہ کا اختتام تین کمروں کے ایک فلیٹ پر ہوا۔ اس نے محل جیسا مکان چھوڑا تھا تو اسے اتنا دکھ نہیں ہوا تھا۔ اس وقت عمر بھی کم تھی اور امیدیں بھی جوان تھیں لیکن اس بار سیمنٹ، مورنگ اور لوہے کا مکان ہی نہیں چھوٹا تھا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اس کا کل اثاثہ، اس کی عمر بھر کی پونجی بھی چھوٹ گئی تھی۔ بچے کہہ رہے تھے:

'اماں! آپ ان کتابوں کا کیا کریں گی؟ پورا ایک کمرہ چاہئے ان کے لئے اور کمرے.....'

'واقعی ان کا کیا کروں گی؟' وہ خود سے پوچھ رہی تھی۔ جواب کون دیتا۔ وہ تو جواب دینے کے لئے وہاں موجود ہی نہیں تھی۔ اپارٹمنٹ کی پارکنگ میں لوگوں کا اچھا خاصہ مجمع تھا۔ سب ہی غمزدہ تھے، افسردہ تھے لیکن کچھ چہروں پر حزن و ملال کے ساتھ فکر کے بڑھتے سائے بھی تھے۔ دراصل مسئلہ میت کا تھا۔ تیسری منزل سے میت کس طرح نیچے لائی جائے۔ صندوق تیسری منزل تک جا نہیں سکتا تھا۔ زینے پر اتنے بے تکے موڑ تھے کہ صندوق آڑا ترچھا کر کے بھی نہیں نکل سکتا تھا۔ لوگ بلڈنگ بنانے والے کو باتیں سنا رہے تھے جنہوں نے یہ نہیں سوچا کہ رہنے والے مر بھی تو سکتے ہیں۔ ہمیشہ کون جیتا ہے۔ کسی نے کہا: 'ایک ترکیب ہو سکتی ہے۔'

سب ہمہ تن گوش ہو گئے اور ان صاحب کی صورت تکنے لگے۔ میت کو چادر میں لپیٹ کر نیچے لایا جائے۔

فکرمند چہروں پر یکایک سکون ٹھہر گیا اور صندوق سورۂ رحمن کی تلاوت کے سائے میں اپنی منزل کی طرف بڑھ گیا۔ یہ اس کی آخری نقل مکانی تھی۔

❑❑❑

افسانچے

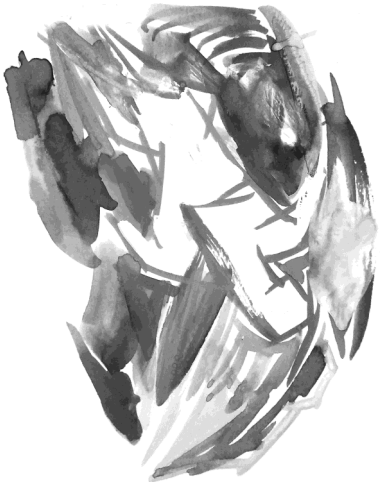

بے رحم

جڑواں بچے پیدا ہونا کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے۔ معاملہ دوسرا تھا۔ شوہر کی غیر موجودگی میں دردِزہ ہونے کے بعد چمپا کو گاؤں کے ایک نرسنگ ہوم میں بھرتی کیا گیا۔ ڈاکٹر نے سیزیرین سے ایک بچی کو بنا تکلیف کے پیدا کرا دیا۔ لیکن اُس کے بعد مریضہ کی حالت سنگین ہوگئی۔ اب جو ڈاکٹر نے دوبارہ معائنہ کیا تو اس عورت کے اندر ایک رحم اور تھا۔ اُس نے دوسرے رحم سے بھی ایک بچی کو نکالا۔

اُس واقعہ کے بعد چمپا سے ملنے والوں کی بھیڑ لگ گئی۔ دوسرے دن غریب شوہر دور شہر سے کام سے چھٹی لے کر حیران و پریشان بیوی کے پاس آیا تو بیوی پر دو لڑکیاں پیدا کرنے کے لئے بہت غصہ ہوا۔ اُس نے عورت کو جنم جلی کہہ کر واپس اپنے میکے چلے جانے کو کہا۔ بہت غل مچایا۔

چمپا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور اپنے شوہر سے رحم کی درخواست کرتی رہی۔ مگر آدمی ماننے والا نہ تھا۔ اُس کے پاس رحم نہیں تھا۔

بے ٹھکانے

چوراہے پر اچانک اپنی شٹل ٹیکسی روک کر ڈرائیور نے پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے آخری مسافر سے کہا ''صاحب آپ کا چوراہا آگیا بی بی'' مسافر خراٹے لے رہا تھا۔ ڈرائیور نے گردن گھمائی اور تقریباً چیخ کر کہا ''صاحب، اُتریے، موڑ آ گیا ہے''۔ اب بھی جواب نہ ملا تو اس نے مسافر کا شانہ ہلایا۔

مسافر سٹپٹایا۔ اس نے دائیں بائیں نظریں ڈالیں اور کہا ''بھئی ذرا اور آگے بی بی موڑ پار کر کے بی بی بس پچاس قدم اور''۔ ''بابو جی رات کے بارہ بج چکے۔ بیس روپے میں کیا آپ کے گھر پہنچا دیں؟ یہ شٹل کار ہے۔ اتر جایئے۔ ہمیں یہاں سے بائیں جانا ہے''۔ ''اچھا تو یہ لو''۔ مسافر بیزاری سے ڈرائیور کو بیس روپے کا نوٹ تھما کر گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے نشے کی ٹھرک میں بولا ''مگر سچ بتاؤ میں نے کب کہا تھا مجھے میرے گھر پہنچا دو؟''۔

ف۔س۔اعجاز

معروف شاعر اور افسانہ نگار

ماہنامہ 'انشاء' کے مدیر،

کئی کتابوں کے مصنف،

مختلف انعامات کے علاوہ ۲۰۱۲ء

میں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے سرفراز

وطن دہلی

25-B، زکریا اسٹریٹ، کولکاتا

رابطہ: 9830483810

بے بس

ایک کہانی تھی۔
کوئی بارہ سال سے ایک جگہ رکی کھڑی تھی۔
آگے بڑھتی ہی نہ تھی۔
جب لے کر بیٹھو تیسرے صفحہ کی اکلوتی سطر کے نیچے وہی ایک سفید خلا۔ بہرحال جہاں تک لکھی گئی اچھی لگتی تھی۔
مگر خوبصورت بات کو تو آگے بڑھنا چاہئے۔ پر نہیں۔ وہ سو کی ایک اڑیل۔ اب تک وہیں کی وہیں عجب بن باس میں اٹکی پڑی ہے۔ اس ادھوری کہانی سے کئی کہانیاں بن گئیں۔ مگر اُس کم بخت کا قدم آگے نہیں بڑھتا۔
آخر کیوں؟۔
بہت کوشش کی تو کوئی دس برس پہلے آدھا صفحہ بات بڑھی۔ مگر کاغذ پر کُھرنڈ اتنے ابھر آئے کہ ان میں سے دو چار جملے محض یوں دکھائی دیتے جیسے زلزلے یا سیلاب کے بعد جوڑ چھوڑی ہوئی ریل کی پٹریاں۔ ٹیڑھی میڑھی، کچھ سوئے فلک گھومی ہوئی۔
پتہ نہیں کیوں میں اُس کہانی کو آگے بڑھانا چاہتا تھا۔ ایک رات میں نے اُسے سفید دودھیا کاغذوں پر دوبارہ صاف کر کے لکھا۔ مگر پھر وہی دو صفحے مکمل اور تیسرے صفحہ کی مانگ میں ایک سطر کا جھومر۔ نیچے کی باقی جگہ جیسے اسپتال کا کورا سپاٹ بستر جو ابھی ابھی کسی مریض کی موت کے بعد خالی ہوا ہو جس پر کوئی بیوہ نرس ایک تازہ دھلی سفید چادر بچھا گئی ہو۔
عجب کہانی ہے۔ نہ اپنا سہاگ بساتی ہے نہ میرا بستر آباد کرتی ہے۔
ایک بار پھر میں نے شروع سے کہانی پڑھی۔
بہت اچھی، بہت عمدہ!۔
اسے پھر نئے کاغذ پر لکھا اور دیکھا۔ حروف خوشنما تھے۔ جیسے سفید سنگِ مرمر پر سیاہ حروف تحریر کر دئے گئے ہوں۔
مگر پھر وہی!۔
خیال کی کھڑکی دوسری جانب نہیں کھلتی۔
اس ادھوری کہانی نے بہت ترسایا۔
کیا کہانی ہے؟۔
آگے سوچنا ہی نہیں سکھاتی۔
آخر ہار کر میں نے کہا
''اے کہانی تُو کیا ہے۔ تو میری زندگی ہے۔ میں تیری طرح ادھورا ہوں۔
میں تجھے نہیں لکھ سکتا۔ تجھے لکھنا میرے بس میں نہیں ہے۔ جیسے میں خود اپنے بس میں نہیں ہوں''۔

جال

میں نے اپنی بھیگی قمیص اور بنیان سوکھنے کے لئے اوندھی ناؤ کے اوپر ایک کھانچے میں اٹکا دیئے تھے۔ قمیص ہوا میں بادبان کی طرح پھڑ پھڑا رہی تھی۔
ہم دونوں الٹی ناؤ کے نیچے آرام سے لیٹ گئے تھے۔ ہواؤں میں لپٹا سلونی خوشبو کا ایک بھبکا آیا۔ شاید کوئی ساحل پر کسی جھونپڑی میں مچھلی تل رہا تھا۔
''بتاؤ ریت پر افسانے کیسے لکھے جاتے ہیں؟''۔ سُمینا نے لیٹے لیٹے میری چھاتی کے بالوں میں اپنی انگلیوں کی پوریں سرسراتے ہوئے کہا۔
میرے ہونٹ جواب دینے کے لئے کُھلے ہی تھے کہ سمندر سے موجوں کا ایک ریلا آیا اور ریت پر نئی تہیں بچھا کر چلا گیا۔
میں نے کہا ''ریت پر افسانے کیسے لکھے جاتے ہیں، ہوا سے پوچھو''۔
تیز ہوا اُس کی زلفیں کنپٹیوں پر لہرا گئی تھی۔ اس نے مُندی آنکھوں سے ریت کی نئی تہوں کو دیکھتے ہوئے کہا:
''ہوا لکھتی ہے یا مٹاتی ہے؟''۔
میں کھجور کی چٹائی پر کہنیوں کے بل لیٹے دور بین سے افق پر اجلے بادلوں کو تک رہا تھا۔ میں نے اُس کی بات کا جواب نہ دیا۔ ایک سکوت ہمارے بیچ در آیا۔ اس بار لہروں کا ایک تیز ریلا بل کھاتا ہوا پورب میں رکھے بڑے بڑے کالے پتھروں سے جا ٹکرایا اور پیچھے جھاگ چھوڑتا ہوا ساحل کی ریت کو ہموار کر گیا۔
کچھ دیر پہلے اس نے جو اپنا پاؤں ڈال کر ریت کا ایک گھروندا اور میں نے جو دل اور تیر کا خاکہ اپنی انگلی سے بنایا تھا دونوں ہموار ہو گئے۔ اپنے گھنگریالے بالوں کو کانوں کے گرد سمیٹتے ہوئے اُس نے خاموشی کو توڑا:
''ہوا لکھے یا مٹائے پانی سب کو دھو دیتا ہے۔''
ایک جھکّڑ نے اس کے سینے کو آنچل سے بے نیاز کر دیا۔ تُند لہروں کے چھپاکے سے بلاؤز کچھ بھیگ گیا تھا۔ میں نے لیٹے لیٹے اُسے اپنی بانہوں میں جکڑتے ہوئے کہا ''آؤ ایک گناہ کر لیں۔ پانی اِسے بھی دھو دے گا''۔
ہم ایک دوسرے میں محو تھے کہ ہماری یکسوئی ٹوٹ گئی۔ کوئی دس بارہ سال کا ایک گنوار لڑکا پھٹے کمبل کو کوٹ کی طرح پہنے کشتی کے باہر آ کھڑا ہوا۔ دھول اٹے لمبے چتھرائے بال پیشانی سے آنکھوں پر لٹکے ہوئے تھے۔ سیلے کمبل سے بالو چپٹی ہوئی تھی بائیں ہاتھ کی دو انگلیوں میں ایسبیسٹس کے دو ٹھیکرے پھنسا رکھے تھے۔ دائیں ہاتھ کے انگوٹھے اور ایک انگلی سے ٹھیک دے کر انہیں بجانا کر گانا شروع کر دیا ''آپ جیسا کوئی میری زندگی میں آئے تو باپ بن جائے، آہاں ہاں باپ بن جائے.....'' نازیہ حسن کا گانا تھا۔ لڑکے نے ''بات'' کو ''باپ'' کر دیا تھا۔ ''اَہاں ہاں باپ بن جائے''۔
پتہ نہیں شرم تھی یا کیا، گانے کے بول سن کر سُمینا

کی آنکھیں جُھک گئیں۔اور میرا مزاج بھی اُکھڑ گیا۔

کچھ دیر سکوت رہا۔ پھر ایک قریبی چٹان کے پیچھے سے ایک کتّا اور ایک کتیا ایک دوسرے پر بھونکتے ہوئے ہمارے سامنے آئے۔ اور ان کے پیچھے کچھ مچھیرے ایک ناؤ کھینچ کر لاتے ہوئے ہمارے قریب سے ساحل کی اور بڑھے۔ شاید وہ سمندر میں مچھلیاں پکڑنے جارہے تھے۔ جال ان کی ناؤ میں لدا ہوا تھا۔

چند منٹوں بعد وہ لڑکا ٹھیکروں پر ''باپ بن جائے'' گاتا ہوا پھر ہمارے آگے سے ہمیں گھورتا ہوا گذرا۔

میں نے زیرلب کہا ''چلو کہیں اور چلتے ہیں۔ سالے کہیں چین سے بیٹھنے نہیں دیتے''۔

اُس نے جلدی جلدی اپنی ساڑی اور بلاؤز کو درست کیا۔ میں نے اوندھی ناؤ سے اٹکی ہوئی قمیص اور بنیان اتار کر پہن لئے۔

اب ہم ناؤ سے باہر آکر اوندھے آسمان کے نیچے چل رہے تھے۔ بھیگی ریت پر ہمارے نقش قدم پیچھے چھوٹتے جارہے تھے۔

مچھیرے سمندر میں جال پھینک چکے تھے!۔

اسکرول

وہ تصویر مجھے اچھی لگتی تھی۔ کمپیوٹر پر کچھ اور ڈھونڈتے ہوئے کب میں نے اُسے ڈاؤن لوڈ کرلیا تھا، یاد نہیں۔ تب سے اسے نجانے کتنی بار دیکھا مگر ماؤز سے اِسکرول کرتے ہوئے آگے یا پیچھے بڑھ جاتا تھا۔ کبھی کبھی اسے تھوڑا زُوم کر کے بھی دیکھا۔ ہمیشہ وہ تصویر اچھی لگی۔ بڑی آرٹسٹک تھی۔

دراصل وہ کسی سبزے کی باڑھ تلے سنگ مرمر میں تراشے ہوئے دو مجسموں کی تصویر تھی۔ پتھر کی بنچ پر بیٹھے بائیں طرف ایک لڑکا سات آٹھ سال کا اور دائیں ایک لڑکی تقریباً اُسی عمر کی۔ دونوں سڈول مجسمے بڑی عمدہ یونانی تراش کا نمونہ معلوم ہوتے تھے۔ لڑکا سفید بوشرٹ اور نیکر میں، لڑکی سفید فراک میں۔ لڑکے کے زانو پر ایک کتاب تھی جسے وہ بہت شوق سے دیکھ یا پڑھ رہا تھا۔ لڑکی بھی جھک کر اسی شوق سے اُس کھلی کتاب کو دیکھ رہی تھی۔ دونوں کے بُتوں پر ذرا ذرا سی کائی جمی تھی۔ دونوں سفید سنگ مرمر سے بنے ہوئے تھے۔ کتاب پر زرد رنگ کا ایک میپل کا چھوٹا پتّا گرا ہوا تھا اور پیڑ سے گرے ایک پتّے نے لڑکی کے منہ کو ناک تک ڈھانپ رکھا تھا۔

آج عامرہ مجھ سے ملنے آئی تب میں ڈاؤن لوڈ فائلوں کو اِسکرول کرتا ہوا کسی فائل کی تلاش میں آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ آکر میرے دائیں کی خالی کرسی پر بیٹھ گئی۔ ناگاہ اُس کی نظر اُس تصویر پر پڑی تو اس نے جھٹ میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا، یہ کیا تصویر ہے دکھاؤ نا۔ میں نے تصویر پر کلِک کیا اور اُسے زوم کر کے عامرہ کی طرف مونیٹر کو ذرا گھما کر کہا، لو دیکھ لو۔

عامرہ نے کہا ''بہت اچھی تصویر ہے، کس قدر معصوم!۔ اتنے سے بچے کیا اتنے شوق سے ملکر کوئی کتاب ایک ساتھ پڑھ سکتے ہیں؟''۔

میں نے کہا ''ابتک اتنا غور نہیں کیا۔ ہاں یہ تصویر کبھی کبھی دیکھتا ضرور ہوں۔ کبھی اسے رسالے کے کسی ٹائٹل پر فِٹ کرنے کا ارادہ ہے۔ رومن بچوں کی شبیہیں معلوم ہوتی ہیں نا؟''۔

''مگر جناب اِن کی آنکھیں کچھ عجیب نہیں لگتیں؟''۔ عامرہ بولی۔

''عجیب کیا ہیں۔ بس کچھ چھوٹی نظر آتی ہیں''۔ میں نے جواب دیا۔ اور مونیٹر کو اپنی طرف کر کے اور زیادہ زوم کر کے دیکھا۔

عامرہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ ان دونوں کی آنکھیں جو مجھے چھوٹی لگتی تھیں دراصل بے نور تھیں۔ دونوں کی پتلیاں کُچلی ہوئی دِکھ رہی تھیں۔ پہلی بار میں نے اِس طرح ان کی آنکھوں کو دیکھا تھا۔ مجھے اپنے سینے میں اُن بے نور مجسّموں کا درد محسوس ہوا۔

''آخر اندھی آنکھوں سے کوئی کتاب کیوں کر پڑھی جاسکتی ہے؟''۔ عامرہ نے سوال کیا۔

''ہاں، پڑھی جاسکتی ہے۔ عشق کی کتاب''۔ میں نے جواب دیا۔

''مجھے آج تک تم نے کھلی آنکھوں سے بھی نہیں پڑھا...''۔ وہ بولی۔

''تم نے میری آنکھوں میں کبھی جھانک کر دیکھا ہی نہیں''۔ بے اختیار میں نے کہا۔

اُس کی نگاہیں جھک گئیں۔ میری بھی جھک گئیں۔ پھر جو ہماری آنکھیں ملیں تو پپوٹوں میں اتھاہ اندھیرا بھرا تھا۔ تبھی اِسکرول گھوم گیا۔ ہم ایک دوسرے کا ہاتھ ٹٹولنے لگے۔

نامحرم

میرے آنے سے پہلے وہ کفن پہن کر راستے میں نکل پڑا۔

اُسے معلوم نہیں تھا کہ میں آرہی ہوں۔

میں راستے میں تھی۔ اُس کی میّت میرے سامنے سے گذری۔ لوگ اُسے قبرستان لے جارہے تھے۔

میں تب اُس نامحرم کو آواز بھی نہ دے سکتی تھی۔

اَماوَس

''اماوس کی رات میں محبت؟ کھُلے آسمان کے نیچے؟''۔

''ہاں! پھر بھی میں نے اُسے گلے سے لگایا اور بھینچ بھینچ کر اُسے پیار کیا۔ اور دور ایک گھنے پیڑ کی شاخ پر بیٹھے گھورتے الّو کی ہری آنکھوں میں آنکھیں گڑائے رکھیں۔ جب تک صبح نہ ہوگئی اور چمگاڈر اندھا نہ ہوگیا!''۔

❑❑❑

جگرؔ مرادآبادی
۱۸۹۰ء ۱۹۶۰ء

ہم کو مٹا سکے یہ زمانے میں دم نہیں
ہم سے زمانہ خود ہے زمانے سے ہم نہیں

غزل

نہ زہرہ جبینوں کے درمیاں گزرے
تو پھر یہ کیسے کٹے زندگی کہاں گزرے

جو تیرے عارض و گیسو کے درمیاں گزرے
کبھی کبھی وہی لمحے بلائے جاں گزرے

ہر اک مقام محبت بہت ہی دلکش تھا
مگر ہم اہل محبت کشاں کشاں گزرے

جنوں کے سخت مراحل بھی تیری یاد کے ساتھ
حسیں حسیں نظر آئے جواں جواں گزرے

خطا معاف زمانے سے بدگماں ہو کر
تری وفا پہ بھی کیا کیا ہمیں گماں گزرے

اسی کو کہتے ہیں جنت اسی کو دوزخ بھی
وہ زندگی جو حسینوں کے درمیاں گزرے

جنہیں کہ دیدۂ شاعر ہی دیکھ سکتا ہے
وہ انقلاب ترے سامنے کہاں گزرے

بہت عزیز ہے مجھ کو انہیں کی یاد جگرؔ
وہ حادثاتِ محبت جو ناگہاں گزرے

جگرمرادآبادی (۶/اپریل ۱۸۹۰ء-۹/ستمبر ۱۹۶۰ء) کی صحت مند دیوانگی کے پیچھے سودوزیاں کا پیمانہ تھا۔ان کی جوانی دیوانی تھی۔ان کے یہاں ساقی وصہبا دونوں سے گہری وابستگی تھی۔ان کی رندی ان کی ادبی زندگی کا ایک لازمی جز ہے۔اس سے ان کی زندگی میں ایک صداقت پیدا ہوگئی جو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ فطری طور پر دلکش نظر آتی ہے۔انہوں نے عشق کیا اور صرف عشق کیا حتیٰ کہ زندگی کو عشق کا تابع کر دیا جس کا نتیجہ تھا کہ ان کی شخصیت میں سوز وگداز پیدا ہوگیا۔شاعری انہیں ورثے میں ملی تھی۔انہوں نے اصغر گونڈوی کی شاگردی میں تغزل کو انتہا تک پہنچا دیا تھا تبھی تو انہیں 'رئیس المتغزلین' کہا گیا۔جگر شاعر اور آرٹسٹ ہونے کے ساتھ ساتھ فن موسیقی سے بھی واقف تھے۔ان کے اندر نغمہ سرائی کا فن بھی بدرجۂ اتم موجود تھا۔یہی وجہ تھی کہ مشاعروں میں جب وہ اسٹیج پر آتے تو سامعین خود جگرؔ کے کلام کی شیرینی اور دردمند آواز سن کر مدہوش ہوجاتے۔۲۱ویں صدی کی ابتدائی دوتین دہائیوں میں جگر کا کلام اور ترنم سارے ہندوستان پر چھایا رہا۔برمحل محاورے،لفظوں کا انتخاب اور استعاروں کی ندرت،عام فہم،شگفتہ زبان اور خیال کی باریکی نے ان کی غزلوں کو مقبولیت کی بلندیوں تک پہنچا دیا۔

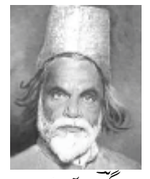

جگر بنیادی طور پر حسن پرست تھے۔انہوں نے غزل کو ایک لطیف تبسم اور دلکش رمز بنا دیا تھا۔حسن وعشق کے بے پناہ پہلو اور شکلیں جگرؔ کے کلام میں ملتی ہیں۔وہ کیف وانبساط جو زندگی کی روح ہے اور جس سے زندگی روشن اور تابندہ ہے اور جو زندگی بسر کرنے کا حوصلہ عطا کرتا ہے،جگر کی شاعری کا ایک بڑا وصف ہے۔جگر کے کلام کا اصل جوہر تغزل ہے جس نے انہیں 'رئیس المتغزلین' کے مقام تک پہنچا دیا۔جگرؔ مرادآبادی کے ۱۲۸ویں یوم ولادت کے موقع پر ادارہ 'نیا دور' کی جانب سے پیش ہیں ان کی چند غزلیں۔

غزل

عشق میں لاجواب ہیں ہم لوگ
ماہتاب آفتاب ہیں ہم لوگ

گرچہ اہل شراب ہیں ہم لوگ
یہ نہ سمجھو خراب ہیں ہم لوگ

ناز کرتی ہے خانہ ویرانی
ایسے خانہ خراب ہیں ہم لوگ

ہم نہیں جانتے خزاں کیا ہے
کشتگان شباب ہیں ہم لوگ

تو ہمارا جواب ہے تنہا
اور تیرا جواب ہیں ہم لوگ

گو سراپا حجاب ہیں پھر بھی
تیرے رخ کی نقاب ہیں ہم لوگ

ہم پہ نازل ہوا صحیفۂ عشق
صاحبان کتاب ہیں ہم لوگ

جب ملی آنکھ ہوش کھو بیٹھے
کتنے حاضر جواب ہیں ہم لوگ

ہم سے پوچھو جگرؔ کی سرمستی
محرم آں جناب ہیں ہم

غزل

دنیا کے ستم یاد نہ اپنی ہی وفا یاد
اب مجھ کو نہیں کچھ بھی محبت کے سوا یاد

میں شکوہ بلب تھا مجھے یہ بھی نہ رہا یاد
شاید کہ مرے بھولنے والے نے کیا یاد

چھیڑا تھا جسے پہلے پہل تیری نظر نے
اب تک ہے وہ اک نغمۂ بے ساز وصدا یاد

جب کوئی حسیں ہوتا ہے سرگرم نوازش
اس وقت وہ کچھ اور بھی آتے ہیں سوا یاد

کیا جانئے کیا ہو گیا ارباب جنوں کو
مرنے کی ادا یاد نہ جینے کی ادا یاد

مدت ہوئی اک حادثۂ عشق کو لیکن
اب تک ہے ترے دل کے دھڑکنے کی صدا یاد

ہاں ہاں تجھے کیا کام مری شدت غم سے
ہاں ہاں نہیں مجھ کو ترے دامن کی ہوا یاد

میں ترک رہ و رسم جنوں کر ہی چکا تھا
کیوں آ گئی ایسے میں تری لغزش پا یاد

کیا لطف کہ میں اپنا پتہ آپ بتاؤں
کیجے کوئی بھولی ہوئی خاص اپنی ادا یاد

سراب

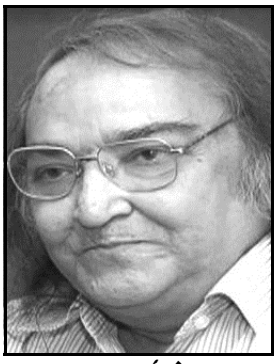

شموئیل احمد

معروف افسانہ نویس اور ناول نگار
کئی ناول اور افسانوی مجموعے شائع
مختلف جرائد میں افسانوں کی اشاعت،
ان کے افسانوں کا انگریزی ترجمہ بھی
شائع، بنیادی طور پر افسانہ نگار
وطن پٹنہ

301، گرینڈ اپارٹمنٹ
نیو پاٹلی پتر کالونی، پٹنہ
رابطہ: 9835299303

بدرالدین جیلانی لیڈی عاطفہ حسین کی میّت سے لوٹے تو اداس تھے۔ اچانک احساس ہوا کہ موت برحق ہے۔ ان کے ہمعصر ایک ایک کر کے گذر رہے تھے، پہلے جسٹس امام اثر کا انتقال ہوا۔ پھر احمد علی کا اور اب لیڈی عاطفہ حسین بھی دنیائے فانی سے کوچ کر گئی تھیں۔ جیلانی کو خدشہ تھا کہ پتہ نہیں خود ان کی روح کہاں پرواز کرے گی....؟ وہ کالونی میں مرنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ اپنے آبائی وطن میں ایک پرسکون موت کے خواہش مند تھے، لیکن وہاں تک جانے کا راستہ معدوم تھا۔ وقت کے ساتھ راہ میں خاردار جھاڑیاں اُگ آئی تھیں۔

جیلانی ریٹائرڈ آئی اے ایس۔ تھے کمشنر کے عہدے سے سبکدوش ہوئے سال بھر کا عرصہ ہوا تھا، بہت چاہا کہ زندگی کے باقی دن آبائی وطن میں گذاریں، لیکن میڈم جیلانی کو وہاں کا ماحول ہمیشہ دقیانوسی لگا تھا۔ اصل میں جیلانی کے والد اسکول ماسٹر تھے اور میڈم آئی اے ایس گھرانے سے آتی تھیں۔ انہوں نے آئی اے ایس کالونی میں ہی مکان بنوانا پسند کیا تھا۔

جیلانی کو کالونی ہمیشہ سے منحوس لگی تھی۔ یہاں سب اپنے خول میں بند نظر آتے۔ ان کو زیادہ چڑھ اس بات کی تھی کہ کسی سے ملنے جاؤ تو پہلے فون کرو۔ کوئی کھل کر ملتا نہیں تھا۔ وہ بات نہیں تھی وطن والی کہ پیٹھ پر ایک دھپ لگایا۔

''کیوں بے صبح سے ڈھونڈ رہا ہوں....؟''

''ارے سالا....جیلانی....؟ کب آیا....؟''

کالونی میں کون تھا جو انہیں سالا کہہ کر مخاطب کرتا اور جیلانی بھی پیٹھ پر دھپ لگاتے....؟ لوگ ہاتھ ملاتے تھے لیکن دل نہیں ملتے تھے۔ یہاں کبھی محلے پن کا احساس نہیں ہوا تھا۔ وہ جو ایک قربت ہوتی ہے محلے میں....ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہونے کا جذبہ....کالونی میں ایسا کچھ بھی محسوس نہیں ہوتا تھا....جیلانی کو لگتا یہاں لوگ مہاجر کی طرح زندگی گذار رہے ہیں۔

کالونی کی بیگمات بھی جیلانی کو ایک جیسی نظر آتی تھیں....وہی اقلیدیسی شکل اور بیضہ نما ہونٹ....! دن بھر سوئیٹر بنتیں اور سیکس کی باتیں کرتیں۔ انگریزی الفاظ کے تلفظ میں ان کے بیضوی ہونٹ دائرہ نما ہو جاتے۔

انسانی رشتوں میں انا کی کیل جڑی ہوتی ہے۔ سب میں بھاری ہوتی ہے باپ کی انا....! باپ کا رول اکثر ویلن کا بھی ہوتا ہے۔

جیلانی نے نے آئی اے ایس کا امتحان پاس کیا تو برادری میں شور مچ گیا۔ خلیل کا لڑکا آئی اے ایس ہوگیا۔ باپ کا بھی سینہ پھول گیا۔ میرا بیٹا آئی اے ایس ہے! میرا بیٹا....انا کو تقویت ملی۔ ایک بیٹا اور تھا، افتخار جیلانی....! والد محترم اس کا نام نہیں لیتے تھے۔ انا مجروح ہوتی تھی۔ افتخار ڈھنگ سے پڑھ نہیں سکا۔ پرچون کی دوکان کھول لی۔ کریلے پر نیم چڑھا کہ انصاری لڑکی سے شادی کرلی....! برادری میں شور مچ گیا....سید لڑکا انصاری لڑکی سے پھنسا....سینہ سکڑ گیا لیکن زخم تو لگ ہی چکا تھا اور روح کے زخم جلدی نہیں بھرتے۔ پھر بھی مرہم جیلانی نے لگایا۔ سارے امتحان میں امتیازی درجہ حاصل کیا۔ جب آئی اے ایس کے امتحان میں بھی کامیابی ملی تو باپ کے پاؤں زمین پر نہیں پڑتے تھے.... یہاں ماسٹر نے اپنے طالب علم کے ساتھ محنت کی تھی۔ شروع میں محسوس کرلیا کہ لڑکے میں چنگاری ہے اس کی پرداخت ہونی چاہئے۔ وہ جیلانی کو ہر وقت لے کر بیٹھے رہتے....بدر! یہ پڑھو.... وہ پڑھو....اخبار کا اداریہ تو ضرور پڑھنا چاہئے....بدر تمہیں کرنٹ افیرز میں ماہر ہونا ہے....مضامین تو رٹ لو....لفظوں کا استعمال کرنا سیکھو....اور جیلانی میں اطاعت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ وہ ہر حکم بجالاتے۔ پھر بھی ماسٹر خلیل کی ڈانٹ پڑتی تھی۔ ان کا بید مشہور تھا....تلفظ بگڑا نہیں کہ بید لہرایا.... سڑاک.... سڑاک....کمینہ....جاہل مطلق....تلفظ بگاڑتا ہے....؟

جو ٹک جاتا وہ کندن بن کر نکلتا۔ کمبخت افتخار ہی ہونق نکلا۔ پڑھتے وقت اونگھنے لگتا.... بید لگاؤ تو چیخنے لگتا....بیہودہ پھنسا بھی تو انصاری گھرانے میں....!

باپ اکثر بھول جاتے ہیں کہ بیٹوں کے پہلو میں بھی دل ہوتا ہے۔ باپ کی انا دل کی دھڑکنوں پر قابض ہوتی ہے۔ جیلانی کے پہلو میں بھی دل تھا۔ جب دسویں جماعت پاس کی تو اس میں حسن بانو کا دل دھڑکنے لگا ....سرخ سرخ ہونٹ....گلابی رخسار.... جھکی جھکی سی آنکھیں....!

استانی کی اس لڑکی کو جیلانی چھپ چھپ کر دیکھتے۔ چوری حیات نے پکڑی۔ حیات کلو مولوی کا لڑکا تھا۔ اس نے ملنے کے اوپائے سجھائے۔

''عید میں ملو....!''

''عید میں....؟''

''ہاں۔! اور رومال مانگنا....!''

حسن بانو نے عطر میں ڈوبا ہوا رومال دیا۔ رومال کے کونے میں نام کے دو حروف ریشم سے کشیدہ تھے۔ بی اور جے....

جیلانی نے غور سے دیکھا تو درمیان میں ایچ بھی نظر آیا۔ بی اور جے کے ساتھ ایچ....یعنی حسن بانو! جیلانی کو لگا کوئی پھول میں لپٹی انگلیوں سے ان کے لب و رخسار چھو رہا ہے....!

ملاقاتیں ہونے لگیں....دونوں دھیمی دھیمی سی آگ میں سلگنے لگے۔ آنچ وقت کے ساتھ تیز ہونے لگی۔ حسن بانو کے بغیر جیلانی کے لئے زندگی کا تصور بھی محال تھا۔ اس سے باتیں کرتے ہوئے انہیں لگتا کہ باہر برف باری کا سلسلہ ہے اور وہ آتش دان کے قریب بند کمرے میں بیٹھے ہیں۔ حیات اس محبت کا اکیلا راز دار تھا۔ یہاں تک کہ جیلانی آئی اے ایس بھی ہوگئے، لیکن زبان کھلی نہیں....مگر ہر راز کے مقدر میں ہے افشا ہونا....!

رحیمن بوا نے دونوں کو حیات کے گھر ایک ہی پلیٹ میں کھاتے ہوئے دیکھا۔

ہر طرف شور....

''ماسٹر کا لڑکا استانی کی لڑکی سے پھنسا۔''

ایک پھنس چکا تھا....دوسرے کی گنجائش نہیں تھی....وہ تو خاک تھا....خاک میں ملا....یہ تو آفتاب تھا۔ بھلا دوکوڑی کی استانی اور جھولی میں آفتاب و مہتاب۔ ویلن غصّے سے پاگل ہوگیا۔ ہسٹریائی انداز میں گلا پھاڑ کر چیخا۔

حرامزادی....چھنال میرے بیٹے کو پھانستی ہے....آ مجھے پھانس....کر مجھ سے عشق....!!

بید لہرایا....

''خبردار بدر جو ادھر کا رخ کیا....خبردار....!''

جیلانی بیمار ہوگئے۔ حسن بانو بدنام ہوگئی۔ اس کا رشتہ جہاں سے بھی آتا منسوخ ہو جاتا۔ آخر جبریہ اسکول میں استانی ہوگئی۔ اطاعت لکیر پر چلاتی ہے اپنی راہ خود نہیں بناتی۔ جیلانی آئی اے ایس تھے، آئی اے ایس کی جھولی میں گرے....کمشنر رحیم صمدانی نے ''آمڈاری ہاؤس'' میں اپنی لڑکی کا رشتہ بھیجا۔

ماسٹر خلیل نے اپنے کھپریل مکان کا نام آمڈاری ہاؤس رکھا تھا۔ یہ آبائی مکان تھا۔ کسی طرح دالان پختہ کرالیا تھا اور اس کی پیشانی پر جلی حرفوں میں کھدوایا....''آمڈاری ہاؤس'' اس سے مفلسی ظاہر نہیں ہوتی تھی، نہ ہی مکان کی اصلیت کا پتہ چلتا تھا، بلکہ رعب ٹپکتا تھا....

ایسا لگتا تھا کوئی انگریز اپنی حویلی چھوڑ کر انگلستان لوٹ گیا ہو....!

اصل میں وہ انگریزی کے استاد تھے۔ اردو کے ہوتے تو مکان کا 'امیر نشاں' یا 'بیت الفردوس' قسم کا نام رکھ سکتے تھے، لیکن انگریزی کے اسکول ماسٹر کی الگ سی ذہنیت ہوتی ہے۔ وہ اپنا تشخص بورژوا طبقے سے قائم کرنا چاہتا ہے۔ رحیم صمدانی نے جب رشتہ بھیجا تو ماسٹر خلیل آمڈاری ہاؤس کے دالان میں بیٹھے چروٹ پی رہے تھے۔

آئی اے ایس سمدھی؟ سینہ پھول کر کُپّا ہوگیا۔

جیلانی جس کمرے میں رہتے تھے وہ کھپر پوش تھا اس میں چوہے دوڑتے تھے۔ شادی کے موقع پر جب مکان کی سفیدی ہونے لگی تو ماسٹر نے کمرے میں

کپڑے کی سیلنگ لگوادی۔

دلہن اسی کمرے میں اتاری گئی....!

وہی اقلیدیسی شکل اور بیضہ نما ہونٹ....!اس کے بال بوائے کٹ تھے۔ وہ سرخ جوڑے میں ملبوس زیور سے لدی تھی....جیلانی بغل میں خاموش بیٹھے تھے۔ان کو محسوس ہورہا تھا وہ ایسے کمرے میں بند ہیں جہاں دریچوں میں ان گنت سوراخ ہیں۔ باہر برف باری کا سلسلہ ہے اور آتش دان سرد ہے؟ اچانک دلہن نے نتھنے پھلائے اور اس کے ہونٹ دائرہ نما ہوگئے۔

''اٹ اسمیلس....!''

جیلانی نے ادھر اُدھر دیکھا...کس چیز کی بو....؟

''اٹ اسمیل لائک رَیٹ....''

''رَیٹ....؟''

''دھبڑ....دھبڑ....دھبڑ....!'' کمبخت چوہوں کو بھی اسی وقت دوڑنا تھا۔

''مائی گڈنیس....'' دلہن نے چونک کر سیلنگ کی طرف دیکھا۔

''یہ کمرہ ہے یا تمبو....؟''

جیلانی ضلع مجسٹریٹ ہوگئے۔ دلہن بدا ہوئی تو میڈم جیلانی بن گئی۔لیکن مہک نے پیچھا نہیں چھوڑا۔ جیلانی کسی تقریب میں آمڈاری ہاؤس آنا چاہتے تو میڈم نتھنے سکوڑتیں۔

''ہاری بل....! دیر از اسمیل ان ایوری کارنر آف دی ہاؤس....!''

اصل میں مسلمانوں کے بعض کھپریل مکانوں میں بکریاں بھی ہوتی ہیں۔آمڈاری ہاؤس میں بکریا بھی تھیں اور مرغیاں بھی۔کہیں بھنا ڑی....کہیں پیشاب.. کہیں لاہی....؟ ایک بار بکری نے میڈم کی ٹانگوں کے قریب بھنا ڑی کردی۔ پائینچوں پر پیشاب کے چھینٹے پڑ گئے.... میڈم پاؤں پٹختی ہوئی تمبو میں گھسیں تو دوسرے دن باہر نکلیں۔ گھر بھر شرمندہ تھا۔ خاص کر ماسٹر خلیل ....اس دن بکری کو باندھ کر رکھا گیا لیکن مرغیوں کو باندھنا مشکل تھا۔ وہ در بے سے نکلتیں تو کٹ کٹ کٹاس کرتیں اور لاہی بکھیرتیں۔ میڈم کو حیرت تھی کہ کس قدر کلچرل گیپ ہے؟ یہاں فرش پر پونچھا تک نہیں لگاتے اور جیلانی حسرت سے سوچتے تھے کہ اگر حسن بانو ہوتی....؟ حسن بانو ہونٹوں کو دائرہ نما نہیں بنا تی....وہ اسے اپنا گھر سمجھتی۔ لاہی پر راکھ ڈالتی اور بٹور کر صاف کرتی...!

کلچرل گیپ کا احساس اس وقت جاتا رہتا جب فضا کی بو بدل جاتی۔ پناہ تو کھپریل مکانوں میں ہی ملتی تھی۔ ایک بار میڈم کو بھی اپنے رشتے داروں کے ساتھ عالم گنج شفٹ کرنا پڑا تھا۔ ان دنوں جیلانی ٹریننگ کے لئے بڑودہ گئے ہوئے تھے۔ میڈم اپنے میکے میں تھیں۔ شہر کے حالات ناسازگار تھے اور فضاؤں میں سانپ اڑ رہے تھے۔ شریف فیملیاں محفوظ جگہوں پر شفٹ ہورہی تھیں۔ رحیم صمدانی تب ریٹائر کر چکے تھے۔سب کے ساتھ عالم گنج چلے آئے۔

''کرایہ پانچ ہزار....!''

''پانچ ہزار....؟ اس کھپریل کا کرایہ پانچ ہزار....؟''

''حضور یہی تو موقع ہے، جب آپ ہمارے قریب آتے ہیں۔'' مالک مکان مسکرایا۔

''دس از ایکسپلائٹیشن''

لیکن کیا کرتے....جان بچانی تھی۔ پندرہ دنوں تک پیشاب سونگھنا پڑا۔ فضا سازگار ہوئی تو کالونی لوٹے۔

جیلانی افسر تھے لیکن میڈم افسری کرتی تھیں میڈم نے آنکھیں ہی آئی اے ایس گھرانے میں کھولی تھیں۔ان کی نظروں میں جیلانی ہمیشہ اسکول ماسٹر کے بیٹے رہے۔ بات بات پر ان کی ترجنی لہراتی....نو....! نیور....!دس از ناٹ دی وے...!

کبھی کبھی تو انگلی کی نوک جیلانی کی پیشانی پر سیدھی عمودسا بناتی....دس از ناٹ فیئر مسٹر جیلانی.... ڈونٹ ڈو لائک دس....! جیلانی کی نگاہوں میں ماسٹر خلیل کا بید لہراتا۔ ان کو محسوس ہوتا جیسے تلفّظ بگڑ رہا ہے۔وہ اکثر کہا کرتیں....طور طریقہ کہاں سے آئے گا؟ یہ خاندانی ہوتا ہے۔ میڈم کو کوفت اس وقت ہوتی جب محلے سے کوئی ملنے چلا آتا۔ ایک بار حیات کو جیلانی نے بیڈ روم میں بیٹھا دیا۔ میڈم اس وقت تو خاموش رہیں، لیکن حیات کے جانے پر انگلی عمود بن گئی۔

''آئندہ محلے والوں کو بیڈ روم میں نہیں بٹھایئے گا، طور طریقہ سیکھئے۔آپ میں او ایل کیو تو ہے نہیں۔''

''او۔ایل۔ کیو....'' جیلانی کو ماسٹر خلیل یاد آتے۔ وہ کہا کرتے تھے۔''بدر....او ایل کیو پیدا کرو....آفیسر لائک کوالیٹی....''

حیات پھر بنگلے پر نہیں آیا۔ وہ ان سے دفتر میں مل کر چلا جاتا۔ ایک بار جیلانی نے اس کو سرکٹ ہاؤس میں ٹھہرادیا۔اس کی خبر میڈم کو ہوگئی۔ کمبخت ڈرائیور جاسوس نکلا۔ جیلانی دفتر سے لوٹے تو میڈم نے نشتر لگایا۔

''آپ آئی اے ایس کیا ہوئے کہ گنگوا تیلی کے دن بھی پھر گئے۔''

جیلانی خاموش رہے تو میڈم نے کندھے اچکائے۔

''ربش....''

جیلانی چپ چاپ کمرے میں آکر لیٹ گئے اور آنکھیں بند کرلیں....اگر حسن بانو ہوتی تو....؟

ان کو ایسے ہی موقع پر حسن بانو یاد آتی تھی اور دل درد کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبنے لگتا تھا....ایک ایک بات یاد آتی....اس کا شرمانا....اس کا مسکرانا، اس کا ہنسنا....! جیلانی کبھی بوسہ لینے کی کوشش کرتے تو دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپالیتی....چہرے سے اس کا ہاتھ الگ کرنا چاہتے تو منتیں کرتی۔

''نہیں....اللہ قسم نہیں....!''

''کیوں....؟''

''گناہ ہے....!''

''گناہ وناہ کچھ نہیں۔''

''کیسی باتیں کرتے ہیں؟''

''یہ پیار ہے....''

''شادی کے بعد....''

''نہیں....ابھی....!''

''پلیز جیلانی....پلیز....!''

جیلانی پگھل جاتے۔ پلیز کا لفظ کانوں میں رس گھولتا....!

اور الفاظ پگھل کر سیسہ بھی بنتے ہیں۔

''حرام زادی.... چھنال ....! میرے بیٹے کو....؟''

جیلانی خود کو کوستے تھے ....کیوں آئی اے ایس ہوئے....؟'' پرچون کی دکان کھولی ہوتی....!

آہستہ آہستہ دوستوں کا آنا کم ہونے لگا تھا۔ جیلانی کا بہت دل چاہتا کہ چھٹیوں میں وطن جائیں اور سب سے ملیں۔ وہاں کی گلیاں اور چوبارے وہ کیسے بھول جاتے جہاں بچپن گذرا تھا۔ ہر وقت نگاہوں میں منظر گھومتا.... وہ میدان میں بیٹھ کر شطرنج کھیلنا.... الفت میاں کے پکوڑے....محرم کا میلہ....مقیم کی قوالی....رومانس کے قصے.... وکیل صاحب کا اپنی نوکرانی سے عشق اور گلی کے نکڑ پر وہ چائے کی دکان جہاں سے حسن بانو کا گھر نظر آتا تھا۔ جیلانی کہیں نظر نہیں آتے تو چائے کی دکان میں ضرور مل جاتے۔

وہ سب کے پیارے تھے۔ دوستوں نے ان کا نام جینئس رکھا تھا۔

ایک بار شاکران کو ڈھونڈتا ہوا آیا۔

''یار جینئیس! محلے کی عزت کا سوال ہے۔''

''کیا ہوا....؟''

''سیسلین ڈیفنس کیا ہوتا ہے؟''

''ایک طرح کی قلعہ بندی جو شطرنج میں ہوتی ہے۔''

''سالا ہانک رہا ہے۔''

''کون؟''

''میدان میں شطرنج کھیل رہا ہے۔ اس نے حیات کو مات دے دی۔''

''ہے کون؟''

''باہر سے آیا ہے یار! عباس بھائی کا سسرالی ہے۔''

''چلو دیکھتے ہیں۔''

''دیکھو جینئس ہارو گے نہیں۔''

''کیا فرق پڑتا ہے۔ کھیل میں تو ہار جیت ہوتی رہتی ہے۔''

''نہیں ایک دم نہیں....سالے کو ہرانا ضروری ہے۔''

''اچھا تو چلو....''

''ہیرو بن رہا ہے۔ بات بات پر انگریزی جھاڑ رہا ہے ....میں نے کہا اپنے جیلانی سے کھیل کر دکھاؤ....؟''

وہ واقعی ہیرو لگ رہا تھا۔ سفید سفاری میں ملبوس.... پاؤں میں چمکتے ہوئے جوتے....سیاہ چشمہ اور گلے میں گولڈن چین....وہ روانی سے انگریزی بول رہا تھا۔ جیلانی نے محسوس کیا کہ اس کی انگریزی سب کو گراں گذر رہی ہے .... کھیل شروع ہوا تو ہیرو نے سگریٹ سلگائی....وہ ہر چال پر کش لگاتا، کوئی چال اچھی پڑ جاتی تو زور زور سے سر ہلاتا اور مصرع گنگناتا.. ''قیامت آئی یوں ....قیامت آئی یوں....!'' جیلانی کے دل کی دھڑکن بڑھ گئی .... ہار گئے تو بے عزتی ہو جائے گی۔ وہ سنبھل سنبھل کر کھیل رہے تھے۔ آخر بھاری پڑ گئے اور مات دے دی۔ دوستوں نے زور دار نعرہ لگایا۔ جینئس زندہ باد....زندہ باد....! ہیرو جب جانے لگا تو شاکر بولا: ''حضور! پینٹ میں پیچھے سوراخ ہو گیا ہے۔ گھر پہنچ کر رفو کروا لیجئے گا۔

حیات نے مصرع مکمل کیا۔

''قیامت آئی یوں....پینٹ بولا چوں۔''

زوردار قہقہہ پڑا۔ جیلانی بھی مسکرائے بغیر نہیں رہ سکے۔

جیلانی آئی اے ایس ہو گئے، لیکن محلے میں اسی طرح گھومتے ....میدان میں شطرنج کھیلتے اور نکڑ کی دکان پر چائے پیتے۔ الفت ان سے پیسے نہیں لیتا تھا۔ وہ پیسہ دینا چاہتے تو الفت بڑے فخر سے کہتا:

''تمہارے لئے چائے فری۔ تم ہماری شان ہو....محلے کی جان ہو....!''

محلے کی جان کالونی میں آکر بے جان ہو گئی تھی۔

ماسٹر خلیل بھی شروع شروع میں بیٹے کے یہاں جاتے تھے، لیکن آہستہ آہستہ ان کا بھی جانا کم ہو گیا۔ اصل میں وہ لنگی پہن کر ڈرائنگ روم میں بیٹھ جاتے اور چروٹ پیتے۔ لنگی اور چروٹ میں فاصلہ ہے جو ماسٹر خلیل طے نہیں کر سکتے تھے۔ لنگی ان کی اوقات تھی اور چروٹ ان کی وہ پہچان تھی جو وہ نہیں تھے۔ میڈم نے پہلے دبی زبان میں ٹوکا، لیکن ایک دن کھل کر اعتراض کر بیٹھیں۔

''آپ ڈرائنگ روم میں لنگی پہن کر کیوں چلے آتے ہیں....؟'' میرے ملاقاتی آخر کیا سوچیں گے؟ میرا بھی ایک اسٹیٹس ہے۔''

جیلانی اس وقت موجود تھے۔ انہوں نے ایک لمحے کے لئے والد محترم کی آنکھوں میں جھانکا۔ جیلانی کی آنکھیں صاف کہہ رہی تھیں....''بھگتو....!''

ماسٹر خلیل اٹھ گئے۔ جیلانی بھی اپنے کمرے میں آکر چپ چاپ لیٹ گئے اور آنکھیں بند کر لیں۔

ریٹائرمنٹ کے بعد جیلانی تنہا ہو گئے۔ کالونی میں کہیں آنا جانا کم تھا۔ ایک ہی بیٹا تھا جو امریکہ میں بس گیا تھا۔ میڈم مہیلا آیوگ کی ممبر تھیں۔ ان کی اپنی مصروفیات تھیں....جیلانی کے والد فوت کر چکے تھے۔ آمڈاری ہاؤس پر افتخار کا قبضہ تھا۔

میڈم نے کالونی میں اپنی کوٹھی بنالی تھی۔ جیلانی کی نظروں میں کوٹھی کی کوئی وقعت نہیں تھی۔ بیٹا امریکہ سے واپس آنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے بعد آخر رہنے والا کون تھا۔؟

مذہب بڑھاپے کا لباس ہے۔ جیلانی کا زیادہ وقت مذہبیات کے مطالعہ میں گذرتا تھا۔ امام غزالی کے بارے میں پڑھا کہ ان کو موت کی آگاہی ہوگئی تھی۔ امام نے اسی وقت وضو کیا اور انا للہ پڑھتے ہوئے چادر اوڑھ کر سو گئے۔ جیلانی بہت متاثر ہوئے۔ بے ساختہ دل سے دعا نکلی .... یا معبود ....! مجھے بھی ایسی موت دے ....! اپنے وطن لے چل ....!

اصل میں کالونی میں مرنے کے خیال سے ہی ان کو وحشت ہوتی تھی۔ یہاں مرنے والوں کا حشر انہوں نے دیکھا تھا۔ تجہیز و تکفین کے لئے کرایے کے آدمی آتے تھے۔ لیڈی عاطفہ حسین کو کوئی غسل دینے والا نہیں تھا۔ کسی طرح پیسے دے کر عالم گنج سے عورتیں منگوائی گئی تھیں۔ جسٹس امام کا لڑکا تو گورکن سے الجھ گیا تھا۔ قبر کھودنے کے ہزار روپے مانگتا تھا۔ آخر سودا ساڑھے سات سو پر طے ہوا۔ جیلانی کو اس بات سے صدمہ پہنچا کہ کالونی میں آدمی سکون سے دفن بھی نہیں ہوسکتا۔ یہ بات وطن میں نہیں تھی۔ محلے میں کسی کے گھر غمی ہوجاتی تو کرائے کے آدمیوں کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ سبھی جٹ جاتے۔ کوئی کفن سیتا، کوئی غسل دیتا۔ صرف گورکن دو سو روپے لیتا تھا۔ قبرستان بھی نزدیک تھا۔ جنازہ کندھوں پر جاتا تھا۔ یہاں تو میت ٹرک پر ڈھوئی جاتی تھی۔ قبرستان ایئرپورٹ کے قریب تھا.... وہاں تک کندھا کون دیتا....؟ سبھی اپنی اپنی گاڑیوں سے سیدھا قبرستان پہنچ جاتے اور سیاسی گفتگو کرتے۔ جیلانی کو کوفت ہوتی۔ اگر برسات میں موت ہوگئی....؟ جیلانی اس خیال سے کانپ اٹھتے تھے۔ برسات میں پورا شہر تالاب بن جاتا۔ جھم جھم بارش میں قبرستان تک پہنچنا دشوار ہوتا۔ گاڑی کہیں نہ کہیں گڈھے میں پھنس جاتی اور ٹرک بھی کون لاتا....؟ اور میت کو غسل دینے والے لوگ....؟ زیادہ الجھن اس بات کی تھی۔ اگر کوئی نہیں ملا تو غسل کون دے گا....؟ کیا پتہ میڈم مول تول کریں اور میّت پڑی رہے....؟

ایک دن نماز میں دیر تک سجدے میں پڑے رہے۔ گڑگڑا کر دعا مانگی:

''یا معبود....! کوئی صورت نکال.... وطن لے چل.... یا میرے مولا.... یا پروردگار....!''

ایک بار آمڈی ہاؤس جانے کا موقع ملا۔ افتخار کی لڑکی کی شادی تھی۔ وہ خود بلانے آیا تھا۔ میڈم نے گھٹنے میں درد کا بہانہ بنایا، لیکن جیلانی نے شادی میں شرکت کی۔ محلے میں بہت کچھ بدل گیا تھا۔ میدان میں جہاں شطرنج کھیلتے تھے وہاں سرکاری پمپ ہاؤس بن گیا تھا۔ کھپریل مکان پختہ عمارتوں میں بدل گئے تھے۔ الفت کی دکان پر اس کا لڑکا بیٹھتا تھا۔ وہاں اب بریانی بھی بنتی تھی۔ افتخار کی دکان بھی اب ترقی کرگئی تھی۔ اس کا لڑکا آمڈاری ہاؤس میں سائبر کیفے چلا رہا تھا۔ حیات کو شکایت تھی کہ محلے میں اب وہ بات نہیں تھی۔ باہر کے لوگ آکر بس گئے تھے، لیکن حق درزی زندہ تھے اور اسی طرح کفن سیتے تھے اور روتے تھے کہ سب کا کفن سینے کے لئے ایک وہی زندہ ہیں۔ حسن بانو کا مکان جوں کا توں تھا۔ وہ ابھی تک جبریہ اسکول میں پڑھا رہی تھی۔ حیات نے بتایا کہ فنڈ کی کمی کی وجہ سے سال بھر سے اسے تنخواہ نہیں ملی۔ محلے کے بچوں کو قرآن پڑھا کر گزارا کر رہی تھی۔ جیلانی نے پوچھا تھا کہ گھر میں اس کے ساتھ اور کون ہے؟

''اس کی بیوہ بھانجی اپنے دو بچوں کے ساتھ رہتی ہے۔'' حیات نے کہا تھا۔

اور جیلانی نے حسن بانو کو دیکھا.... وہ حیات کے ساتھ الفت کی دکان سے چائے پی کر نکلے تھے۔ حسن بانو گھر کی دہلیز پر لاٹھی ٹیک کر کھڑی تھی۔ سارے بال سفید ہوگئے تھے۔ ایک پل کے لئے ان کی نگاہیں ملیں۔ جیلانی ٹھٹھک گئے۔ حسن بانو بھی چونک گئی۔ اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی اور چہرے پر حجاب کا نور چھا گیا۔! جیلانی کے دل میں ہوک سی اٹھی۔ انہوں نے حیات کا ہاتھ تھام لیا۔ حسن بانو اندر چلی گئی۔

''پلیز جیلانی.... پلیز....!''

''میں اس کا گناہگار ہوں۔'' جیلانی کمزور لہجے میں بولے۔

حیات خاموش رہا۔

''مجھے اسکی سزا بھی مل گئی۔ میں جلاوطن ہوگیا۔''

''جانتے ہو تمہارا قصور کیا ہے ....؟'' حیات نے پوچھا۔

''کیا....؟''

''اطاعت گزاری....!''

جیلانی دل پر بوجھ لئے اسی دن لوٹ گئے۔

دوسرے دن صبح صبح حیات کا فون آیا۔

''حسن بانو گزر گئی....!''

''گزر گئی....؟'' جیلانی تقریباً چیخ پڑے۔

''ایسا کیسے ہوا....؟''

''اس دن جب تمہارا دیدار ہوا۔ بستر پر لیٹی، پھر نہیں اٹھی۔''

جیلانی پر سکتہ سا چھا گیا۔

''وہ جیسے تمہاری ہی راہ تک رہی تھی۔''

جیلانی نے فون رکھ دیا۔

''کس کا فون تھا؟'' میڈم نے پوچھا۔

جیلانی خاموش رہے، آنسوؤں کو ضبط کرنے کی کوشش کی۔

''مائی فٹ!'' میڈم منہ بچکاتی ہوئی کمرے سے نکل گئیں۔ جیلانی نے تکیے کو سینے سے دبایا اور آنکھیں بند کرلیں۔

❑❑❑

بدرا مت برسو مورے انگنا

رومی ملک

افسانہ نویس وشاعرہ
مختلف رسائل وجرائد میں افسانوں کی اشاعت، آل انڈیا ریڈیو، پٹنہ سے متعدد افسانے نشر، افسانوی مجموعہ اور غزلوں اور نظموں کے مجموعے زیر طبع، فی الحال بحرین میں مقیم، وطن جہان آباد

المیر ٹریڈینگ اسٹیبلشمنٹ
پی او باکس 512، منامہ (بحرین)
roomy39877@gmail.com

اپنی کھڑکی سے نظر جمائے آسماں کو تک رہی تھی۔ میں نے دیکھا آسمان کا ایک کنارہ کالا ہو رہا ہے۔ شاید بادل کا ٹکڑا ہے۔ میں دوڑتی بھاگتی دھپ دھپ کرتی کئی سیڑھیاں ایک ساتھ پھلانگتی چھت پر آ گئی۔ آسمان پر کالے بادل کے آوارہ ٹکڑے کو ہوا کے دوش پر لہراتے دیکھ کر دل مسرتوں سے جھوم اٹھا۔ کتنی شدت سے مجھے موسم کی پہلی بارش کا انتظار تھا۔ لیکن لمحہ بھر میں میری خوشی کافور ہوگئی۔ آسمان بالکل صاف اور بادل کا کالا ٹکڑا جانے کہاں غائب ہوگیا۔ بڑی ڈھٹائی سے تابناک سورج مجھے منھ چڑا رہا تھا۔

'یہ لڑکی دھوپ میں کیا کر رہی ہے؟' بھائی جان کی آواز آئی۔

'بارش کا انتظار کر رہی ہوں۔' میں نے اوپر سے ہی اونچی آواز میں جواب دیا۔

'تمہارا دماغ خراب ہے۔' بھائی جان اوپر آ گئے۔

'میں نے آسمان پر کالے بادل دیکھے۔'

'اب تو نہیں ہیں..... پھر دھوپ میں کیوں تپ رہی ہو؟'

'یہ سورج مجھے منھ چڑا رہا ہے۔ بادل سے کہہ رہی ہوں آ کر اس کے منھ پر کالک مل دے۔' میں نے معصومیت سے کہا۔

'بادل تمہاری بات سن رہا ہے۔'

'کاش سن لیتا۔'

'سن لے گا تب آ جانا اس وقت تو نیچے چلو۔'

'بھائی جان وہ دیکھو بادل۔

بادل کا ایک ٹکڑا لہراتا ہوا پھر سے سطح افق پر نمودار ہو گیا۔

'پاگل مت بنو نیچے چلو..... ورنہ اماں کی ڈانٹ سننا پڑے گی۔'

'بادل نہیں چھائے۔ پانی نہیں برسا اور میں سورج کو گھورتی ہوئی نیچے آ گئی۔'

'اماں چار بج گئے کریمن بوا ابھی تک نہیں آئیں۔'

بچہ بیمار ہے ساس کی طبعیت بگڑ گئی نند سے جھگڑا ہو گیا ڈھیروں بہانے ہیں بوا کے پاس...' کفگیر چلاتی اماں تنک کر بولیں۔

'اماں الٹا ہی کیوں سوچتی ہو ہوسکتا ہے وہ سچ کہتی ہوں۔'

'تو میں جھوٹی ہوں؟' اماں بگڑ اٹھیں۔

'توبہ میں نے ایسا کب کہا؟'

غصے میں ان کا ہاتھ تیزی سے چلتا ہے۔ حلوہ گھوٹ رہی تھیں۔ کفگیر تیز چلنے لگا۔ چنے کا حلوہ بھائی جان کی مرغوب غذا ہے۔ ان کی پسند کا خیال رکھ کر اماں اکثر حلوہ بناتی ہیں۔ حلوے کی سوندھی سوندھی خوشبو باورچی خانے سے نکل کر دالان تک میں پھیل رہی تھی۔

اس دن کریمن بوا نہیں آئیں۔ دوسرے دن جب وہ آئیں تو ان کے چہرے پر چھائی پژمردگی اور آنکھوں میں ویرانی دیکھ کر مجھے تشویش ہوئی۔

'کیوں بوا خیریت تو ہے؟'

'بی بی میرا بیٹا بیمار ہے کئی دنوں سے بخار ہے۔'

'ڈاکٹر کو دکھایا؟'

'ہاں دکھایا فائدہ نہیں ہے۔ بخار اترنے کا نام نہیں لیتا۔' وہ سسک اٹھیں۔ اپنے آنچل سے آنسو پوچھتی ہوئی باورچی خانے میں چلی گئیں۔

اف! یہ غربت۔ بیٹا بیمار ہے۔ اسے چھوڑ کر دوسروں کا چولہا چوکا کرنے آگئیں۔ مجھے ان کی حالت پر ترس آگیا۔ میں نے یہ کہہ کر چھٹی دے دی کہ تمہارا بیٹا جب ٹھیک ہوجانا تب آنا۔

اماں نے سنا تو بگڑ اٹھیں۔

'خود مختار بن بیٹھی ہو۔ کس کی اجازت سے تم نے اسے چھٹی دی؟'

'اماں بگڑتی کیوں ہو؟ ان کا بیٹا بیمار ہے آپ کو تکلیف نہیں ہوگی۔ میں سارا کام کرلوں گی۔' میں نے اماں کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

عجیب خودسر لڑکی ہے۔ جو دل چاہے کر بیٹھتی ہے۔ بڑوں سے رائے مشورہ لینا اس نے سیکھا ہی نہیں۔' میری شان میں اماں جانے کیا کیا قصیدے پڑھتی چلی گئیں۔ میں خاموشی سے کام میں جٹ گئی۔

چار دن گزر گئے۔ بوا نہیں آئیں۔ مجھے تشویش ہوئی۔ کہیں ان کا بیٹا زیادہ بیمار تو نہیں پڑ گیا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ بوا کے گھر جاؤں گی۔ اماں نے سنا تو برس پڑیں۔

'پاگل ہوگئی ہو اس بستی میں جاؤ گی لوگ کیا کہیں گے؟'

'حد ہے انسان سے ملنے پر سوال لوگ کیا کہیں گے؟'

'اماں تم.... تم تو عظیم ہو۔ تم کیوں کر اس بے حس، بوسیدہ اور بیمار معاشرے کا حصہ بن سکتی ہو جس نے ہمیشہ غریبوں کو الگ سمجھا ان کی تذلیل کی ان سے اسی طرح نفرت آمیز سلوک روا رکھا جیسے ناپاک سمجھے جانے والے جانوروں سے رکھا جاتا ہے۔ حالانکہ جانور بھی معصوم ہوتے ہیں اماں۔ 'غریب بھی معصوم ہیں ہم تسلیم کریں نہ کریں، انسانی برادری کا درجہ دیں نہ دیں، یہ انسان ہی ہیں۔'

'اس میں برائی کیا ہے اماں؟ اس بستی میں انسان ہی تو رہتے ہیں۔'

'تم وہاں نہیں جاؤ گی۔' اماں کا لہجہ حتمی تھا۔

'اماں میں اسکول جاسکتی ہوں کالج جاسکتی ہوں، بازار جاسکتی ہوں، پھر وہاں کیوں نہیں جاسکتی؟ میری اچھی اماں پلیز مت روکو مجھے جانے دو۔'

میں نے اماں کے گلے میں پیچھے سے اپنی بانہوں کا ہار ڈالتے ہوئے خوشامدانہ انداز میں کہا۔ بالآخر اماں نے میری بات مان لی۔ اس سے پہلے کہ اماں کا ارادہ بدلے میں وہاں سے چل پڑی۔ میں تمام راستے اماں اور ان کے بوسیدہ بیمار معاشرے کے بارے میں سوچتی رہی۔ خود کو اعلیٰ اور ارفع سمجھنے والے یہ لوگ غریبوں کو بالکل اسی طرح دیکھتے ہیں جس طرح زندہ رہ جانے والے مرے ہوئے کے بارے میں سوچتے ہیں۔ بے جان بے وقعت

میرا رکشہ کریمن بوا کے گھر تک نہیں جاسکا۔ ان کے گھر تک جانے والی گلی کافی تنگ اور پیچ دار تھی، میں رکشہ سے اتر گئی۔ چند فاصلہ ہی طے کر پائی کہ گلی کے مہانے پر ایک بڑے سے گندوڑے (کوڑے کے ڈھیر) کا سامنا ہوا۔ گندوڑے کی بائیں جانب ایک گھر کی دیوار کے ساتھ کھرلی پر بندھی بھینس جگالی کر رہی تھی جس کی پشت پر بیٹھا کوا چونچ مار رہا تھا۔ اسی گھر کی دیوار پر ایک عمر رسیدہ عورت گوٹھا (اپلے) تھاپ رہی تھی۔ کوڑے کی غلاظت سے بچ کر نکلنا مشکل تھا۔ میں احتیاط سے قدم آگے بڑھاتی گئی۔ گندوڑے کی راکھ پر ایک کڑک مرغی اپنے چوزوں کو دانا کھلا رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے اپنے پر پھڑ پھڑا کر چوزے کو اپنے اندر سمیٹنے کی کوشش کی۔ مرغی اپنے بچوں کو خود اعتمادی سے روکتی ہے۔ آنے والے خطرے کے پیش نظر خود سے چپکا لیتی ہے۔ اس کی پھڑ پھڑاہٹ اتنی تیز تھی کہ راکھ اوپر کو اٹھتی ہوئی چاروں طرف پھیل گئی۔ اس راکھ سے بچنے کی کوشش میں گندوڑے پر پڑا ادھوڑا (اینٹ کا ٹکڑا) میرے پاؤں کے نیچے آگیا میرا توازن بگڑا۔ کسی صورت خود کو سنبھالا تبھی میرے منہ سے گھٹی گھٹی چیخ نکل گئی۔ میں زرد پڑ گئی۔ میرا پاؤں ایک بڑے سے مرے ہوئے چوہے کی دم پر تھا۔ میری چیخ سن کر مرغی کوں کوں کٹ کٹ کی آواز نکالنے لگی۔ پاس ہی جلی ہوئی جلد والا ادھ ننگا بچہ کوڑے کے ڈھیر سے کچھ چن رہا تھا۔ وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔ گوٹھا تھاپتی عورت کے ہاتھ رک گئے۔ اس نے بچے کو گھور کر دیکھا اور مجھ پر ہمدردی بھری نظر ڈالی۔ میں نے اپنے حواس درست کئے۔ اب میں ایک ایک چیز کا بغور جائزہ لیتی قدم رکھنے لگی۔ اف کتنی گندگی، کتنا تعفن ہے۔ مخصوص دنوں میں استعمال شدہ کپڑے بے ترتیب آڑے ترچھے بکھرے ملے۔ جنہیں عام طور پر عورتیں گھر میں سنبھال کر سب کی نظروں سے بچا کر رکھتی ہیں۔

بچپن میں کبھی میں کریمن بوا کے ہمراہ ان کے گھر آئی تھی۔ اس لئے گھر ڈھونڈنے میں زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ میں نے دستک دی۔ گلی میں دروازوں پہ بیٹھی سہ پہر کی گپیں مارتی ہوئی عورتیں اور پاس کھیلتے بچے مجھے دلچسپی سے دیکھنے لگے۔ چند ایک عورتیں اپنے بچوں کے سروں سے جوئیں نکالنے میں منہمک تھیں۔ دروازہ کھلا تھا۔ اندر سے کسی کے کھانسنے کی آواز آرہی تھی۔ دروازے پر کریمن بوا مجھے دیکھ کر مجسمہ حیرت بن گئیں۔

'بی بی جی آپ؟'

'تمہارا بیٹا کیسا ہے بوا؟'

'آپ یہاں؟' میں دروازے پر کھڑی تھی۔

'تمہارا بیٹا ٹھیک ہے نا؟' میں اندر آ گئی۔

کمرے میں موجود سیلن، گھٹن اور غربت کی تیز بساہند نے میرا استقبال کیا۔ اندر دو چار پائیاں پڑی ہوئی تھیں۔ ایک پر ایک شخص گھٹنوں کے بل جھک کر اپنی جانگوں سے سینے کو دبائے گہری گہری سانس لے رہا تھا۔ چارپائی کے نیچے مٹی کے برتن کا ٹوٹا ہوا ایک حصہ رکھا تھا۔ جس میں چولہے کی راکھ بھری تھی۔ اس میں جذب گاڑھے گاڑھے بلغم پر بہت ساری مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ اس بوڑھے شخص نے حلق صاف کر کے بلغم اس برتن میں گرایا تو کمرے میں اس کی سانسوں کی سائیں سائیں کے ساتھ مکھیوں کی بھنبھناہٹ گونج اٹھیں۔ دوسری چارپائی پر دس بارہ برس کا ایک لڑکا لیٹا ہوا تھا۔ لڑکے کے سرہانے دو جوان لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ غالباً وہ بوا کی بیٹیاں ہوں گی۔ ایک چھوٹا لڑکا زمین پر سویا ہوا تھا۔ شاید یہ بوا کی بیوہ نند کا بیٹا ہے۔ پاس ہی سفید میلی سی ساڑی میں ملبوس اسکی نند بیٹھی تھی۔ جسکی ساڑی میں جگہ جگہ پیوند چسپاں تھے۔

'بی بی جی میرے بیٹے کا بخار نہیں اترا۔ ابھی بھی بے سدھ پڑا ہے۔ میں کافی پریشان ہوں اس لئے نہیں آسکی۔' انہوں نے صفائی دی۔

'میں تمہارے بیٹے کو دیکھنے آئی ہوں۔'

'کیا؟'

وہ بے یقینی سے مجھے تکنے لگیں۔ اپنے آنچل سے کونے میں رکھی اکلوتی کرسی صاف کر کے مجھے بیٹھنے کو بولیں۔ میں نے غور کیا وہ کرسی نہیں تھی۔ اسٹول بھی نہیں تھا جو بھی تھا بیٹھنے کے لائق تھا۔ گرمی سے میرا برا حال ہونے لگا۔ بوا میرے ایک دو سوالوں کا جواب دے کر چپ ہو گئیں۔

حبس گھٹن گرمی اور سب کی خاموشی نے مل کر ماحول کو بوجھل بنا دیا۔ میں نے پرس سے کچھ روپے نکال کر بوا کو دیئے کہ اپنے بیٹے کا علاج ٹھیک سے کرائے۔

چند روپئے بوا کے ہاتھوں میں رکھ کر میں نے ان کی مشکل کشائی کی یا اس مد میں یہ عنصر شامل ہے کہ میں دینے کی اہلیت رکھتی ہوں۔ اس دن بوا کے حال پر ترس کھا کر میں نے انہیں چھٹی دی تھی آج روپئے دیئے۔

خیرات؟ ان کا حق؟ یا میرا فرض؟ میرے اندر ایک تیز ہوا کا جھونکا آیا اور گزر گیا۔

میں اٹھ گئی۔ 'چلتی ہوں۔'

'میرے تو نصیب جاگ گئے بی بی جی'

'تم سب اسی کمرے میں رہتی ہو؟'

سیلن گھٹن اور حبس زدہ ماحول کے ساتھ ساتھ کمرے میں موجود تعفن میرے نتھنوں سے ہو کر پھیپھڑوں تک پھیلنے لگا جس کی وجہ سے سانس لینے میں دشواری محسوس ہوئی تو یہ سوال میرے منہ سے نکل گیا۔

'اندر آنگن ہے بی بی جی۔ بنا چھت کا ایک کمرہ ہے جہاں کھانا بنتا ہے۔'

اچانک بادل کے گرجنے کی آواز آئی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اندھیرا مسلط ہو گیا۔ بوا کی نند لپک کر اندر کی جانب گئی۔ کچھ ہی پل میں ایک چارپائی گھسیٹتی ہوئی اندر لے کر آئی۔ چھتوں اور کھڑکیوں کے چھجوں پر شور مچاتے ہوئے بارش کے قطرے بڑی تیزی سے گرنے لگے۔ موسم کی پہلی بارش شروع ہو گئی۔

'اف میں کہاں آ پھنسی؟'

پہلی بارش کی بوندیں جب خشک دیواروں میں جذب ہوتی ہوئی سوندھی سوندھی بیش بہا خوشبو فضا میں پھیلاتی ہوئی نتھنوں سے ٹکراتی ہیں تو دل مسرور ہو کر کس قدر جھوم جھوم جاتا ہے۔ جس بارش کا میں شدت سے انتظار کرتی رہی۔ جس کے لئے میں گھنٹوں چھت پر کھڑی بادلوں کو گھورا کرتی اس جھونپڑی میں بارش کا لطف کس طرح اٹھاؤں؟ یہاں تو سیلن گھٹن اور تعفن سے دم گھٹ رہا ہے۔ میں بے بسی کے عالم میں گھر جانے کے لئے سوچنے لگی۔ بوا دروازے تک گئیں ہاتھ پھیلا کر بارش کے زور کا اندازہ کیا۔

'بی بی جی بارش تیز ہو گئی ہے۔ ٹھہر جائیں پانی تھم جائے گا تب میں آپ کو چھوڑ آؤں گی۔'

بارش کی آواز تیز ہونے لگی۔ بارش سے بچنے کے لئے چڑیا کا ایک جوڑا آنگن کی جانب کھلی کھڑکی سے ہوتا ہوا کمرے کے مچان پر آ کر چھپ گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ سوندھی سوندھی خوشبو کی جگہ بساند اور تعفن کا بھبکا نتھنوں سے ٹکرایا تو ابکائی سی آئی۔ تعفن بہت تکلیف دہ تھا۔ ایسی بدبو سے کبھی واسطہ نہیں پڑا۔ گرمی کی شدت نے بھی میرا برا حال کر دیا۔ جسم کے مساموں سے ننھی ننھی چپ چپی بوندیں نکل کر میرے ریشمی کپڑوں میں جذب ہونے لگیں۔ کپڑے بدن سے چپکے تو بدن میں تیز چنچناہٹ محسوس ہوئی دو پل ٹھہرنا میرے لئے مشکل ہونے لگا۔ اس تیز بارش میں نکلنا بھی ممکن نہ تھا میں ادھ مری سی لاچار بیٹھی رہی۔ میرا ذہن بدن کی چنچناہٹ اور پسینے کی چپچپاہٹ سے نکل کر یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ ایسے حالات میں یہ لوگ آخر کس صورت جی لیتے ہیں۔

کیا واقعی یہ جی رہے ہیں؟

تبھی ٹپ سے پانی کی ایک بوند میرے سر پر گری۔ میں اس ایک ننھی سی بوند کا مقابلہ کرتی تب تک بڑی بڑی کئی بوندیں لگاتار مجھ پر گرنے لگیں۔ میں نے اٹھنا چاہا تو دیکھا چھت ایک جگہ سے نہیں بلکہ کئی جگہوں سے ٹپک رہی ہے۔ میرا اٹھنا بیکار تھا۔ میں بیٹھی بیٹھی بھیگتی رہی۔ بوا کا بیمار بیٹا اس ٹپ ٹپ سے نہیں بچ پایا۔ اس کی بہنیں اسے چادر سے ڈھکنے کی لاحاصل کوشش کرنے لگیں۔ بوڑھے نے کھانسنا بند کر دیا۔ وہ بھی بارش کی بوندوں سے بچنے کے لئے پہلو بدلنے لگا۔ پھر دیکھتے دیکھتے جانے کس طرح فرش پر پانی آ گیا۔ بچہ اٹھ کر رونے لگا۔ اس کی ماں نے اسے گود میں اٹھا لیا۔ اندر سے بھیگتی ہوئی بوا کی ساس کمرے میں آئیں۔ ایک کونے میں رکھی گٹھری کھولی اس میں سے چند گندے کپڑے نکالے اور اندر کی جانب مڑ گئیں۔ وہ میری طرف سے بے نیاز تھیں۔ بوڑھا بول اٹھا۔

'پانی میں کیوں بھیگتی ہو کپڑے بعد میں دھل جائیں گے۔' بوڑھے کا لہجہ حاکمانہ تھا، چہرے پر عمر کی لکیریں ہی نہیں درشتگی اور کرختگی بھی نمایاں تھیں۔

'ہاں دھل جائیں گے لیکن برسن کے پانی جیسا صاف نہیں ہوگا۔

وہ اندر چلی گئیں۔ پھر زور زور سے کپڑے پٹخنے کی آوازیں آنے لگیں۔ بارش نے زور پکڑ لیا۔ چھت سے اتنا زیادہ پانی ٹپکنے لگا کہ بچنا مشکل ہونے لگا۔ بہنوں کی لاکھ کوششیں اپنے بیمار بھائی کو چھت سے ٹپکنے والے پانی سے محفوظ نہیں رکھ پائیں۔ ہم چھت کے نیچے تھے لیکن کھلی چھت کا گمان ہو رہا تھا۔ شام ڈھلنے لگی۔ قبل از وقت رات کی سیاہی اپنی چادر پھیلانے لگی۔ میرے لئے مزید ٹھہرنا مشکل تھا۔ میں نے بوا سے اجازت مانگی۔ اتنی تیز بارش میں وہ پہلے نہ مانی۔ پھر اپنے ساتھ گھر چھوڑنے کے لئے رضامند ہوئیں۔ جیسے تیسے گھر پہنچی۔ بارش میں شرابور میں نے جب گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا تو اماں کی دھاڑ نے میرا استقبال کیا۔ بھائی جان نے بھی آج اماں کی حمایت کی۔ میں سب کی ڈانٹ سنتی رہی۔ رات بے حد کالی اور بھیانک تھی۔

تمام رات بارش ہوتی رہی۔ بارش اتنے زور کی تھی کہ میرے کمرے کے روشن دانوں سے پھوار اندر آ رہی تھی۔ جو کمرے کے حبس میں گھل کر ماحول کو مزید بوجھل بنا رہی تھی۔ کمرے کے بڑھتے حبس کو میں نے اپنے اندر اترتا محسوس کیا۔ بارش کی آواز سے جانے کیوں مجھے بے حد وحشت ہونے لگی تھی۔ اسی وحشت کے زیر اثر کبھی چہل قدمی کرتی کبھی دریچے سے جھانک کر بارش کے زور کا اندازہ لگاتی۔ باہر کتنا کثیف اندھیرا ہے معلوم ہوتا ہے روشنی کا وجود ہی نہیں بلکہ ایک گہری کالی چادر ہے جسے زمین کی قبر پر چڑھا دیا گیا ہے۔ بارش کی آواز اس قبر جیسے اندھیرے میں بڑی ہولناک لگ رہی تھی ایک ایسی ہولناکی جو میرے جسم سے ہوتی ہوئی دل و دماغ میں پیوست ہوئی چلی جا رہی تھی۔ رات ٹھہر سی گئی۔

بارش چھت پر بہت زوروں سے پڑ رہی تھی۔ بارش کی آواز بتدریج بڑھتی گئی۔ اچانک آواز کسی دکھیارن کے بین میں تبدیل ہوتی محسوس ہوئی۔

کون ہے یہ نوحہ گر؟

ایک بار پھر میں نے کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا۔ باہر کی سیاہی مجھے سرخی مائل لگی۔ بارش تیز تھی۔ چھینٹے میرے چہرے پر پڑنے لگیں۔ چہرے سے ٹپکتا ہوا ایک قطرہ میرے ہاتھ پر گرا۔ جس کا رنگ سرخ تھا۔

میں اپنا ہاتھ نتھنوں کے قریب لے گئی۔ مجھے ابکائی سی آئی۔

خون کی بو؟

بین کرتی آوازیں بے ہنگم قہقہے میں تبدیل ہو گئیں۔ بے حد عجلت اور گھبراہٹ کے ساتھ میں نے کھڑکی کے پٹ بند کر دیئے۔ مگر وہ آوازیں اندر بھی موجود تھیں۔

حبس اور بڑھ گیا تھا۔

قریب ہی کسی گھنٹا گھر نے پانچ بجائے تھے۔

بارش کمزور پڑنے لگی تو آوازیں بھی مدھم پڑ گئیں جیسے کسی دوسری دنیا سے آتی محسوس ہوئیں۔

غربت اور بارش کی دوطرفہ مار جھیلتا کریمن بوا کے گھر کا منظر میرے حواس پر قابض رہا۔ یہ طوفانی برساتی رات اور بوا کی جھونپڑی کی خستہ حال بنیاد۔

کیا میں بوا کے بیٹے کو گھر لا سکتی تھی۔

اماں اجازت دیتیں؟ شاید نہیں۔

کیوں دیتیں؟ اس دنیا میں کتنی مجبور کتنی بدقسمت مائیں موجود ہیں؟ کیا ہم سب کو پناہ دے سکتے ہیں؟ نہیں، نہیں دے سکتے۔

کمبخت کو بوا کے گھر پیدا ہی نہیں ہونا چاہئے تھا مگر اس بات کا تعین کون کرے کہ کس فرد کو کس گھر میں پیدا ہونا ہے؟ اف کتنی بے رحم کتنی ظالم کتنی کمینی جگہ ہے یہ دنیا! یا.... وہ ظالم اور سفاک ہے جو بوا کے مطابق آسمان پر رہتا ہے۔ تو کیا وہ جسے بوا خدا کہتی ہے اس زمین اور آسمان کے درمیان کوئی ایسی پناہ گاہ نہیں بنا سکتا جہاں کریمن بوا جیسے لوگ رہ سکیں۔ میرا بس چلے تو میں اس سے اس کا آسمان چھین کر کریمن بوا کے سر پر اوڑھا دوں تاکہ وہ آسمان سے آسمان تک کے سفر پر ہی گامزن نہ رہے..... کبھی زمین پر بھی اترے اور دیکھے اس کی مخلوق جینے کے لئے کتنے مصائب کتنی اذیتیں جھیل رہی ہے۔ خدا کی اس سفاکیت پر رونے کے لئے میری آنکھ آنسو تلاش کرتی ہے جو مجھے نہیں ملا۔

بارش تھم گئی۔

لیکن پانی کے اکا دکا قطرے رہ رہ کر ٹپ ٹپ کی آواز کے ساتھ اب بھی گر رہے تھے۔

کمرہ بستر ذہنی کشمکش اور رات بھر کے تھکے ہوئے جسم میں ریزہ ریزہ اترتی ہوئی وحشتوں اور تلخیوں کا ازالہ بستر پر آ گری۔ نیند نے مجھے اپنی آغوش میں لے لیا۔ سارا دن میں سوتی رہی۔ ہوش تب آیا جب اماں مجھے جھنجھوڑ رہی تھیں۔

'رومی..... رومی'

اماں کی آواز میلوں دور سے آتی محسوس ہوئی لیکن ان کے لہجے کی لرزش نے میرے ہوش اڑا دیئے میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی

'کیا ہوا اماں؟'

'بوا کا بیٹا نہیں رہا۔'

'میری جلتی ہوئی آنکھیں پتھی پھٹی سی پتھرا گئیں۔'

ایک عجیب سی بو میرے نتھنوں سے ٹکرانے لگی۔ میں نے دیکھا میرے اطراف خون ہی خون تھا۔ مجھے ابکائی آئی۔

میرے اندر ہوا کا وہ جھونکا جو اکثر مجھے بے ترتیب کر کے گزرتا رہا ہے طوفان کی صورت مجھ میں برپا ہو گیا۔

اسے خون کی بو سے ابکائی کیوں نہیں آتی؟

❑❑❑

بری عورت

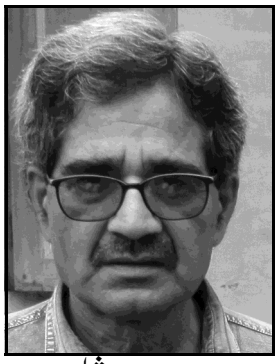

مستجاب شیلی

شاعر اور افسانہ نویس

بنیادی طور پر ہندی ناول نگار

ریالسٹک پینٹنگس کے متعدد

سولو اور گروپ شوز، کیمپس

اور ورک شاپس کی فعالیت

وطن امروہہ

105، بیگم سرائے خورد، امروہہ

رابطہ: 9897103834

عفّان تھا نام اس کا
ابھی کچھ دیر ہوئی ہے، تمام لوگ اُسے
دفن کر کے چلے گئے تھے
سبھی تھے ان میں.....
اس کی اولاد و خاندان والے، اس کے دوست دیرینہ
رشتے دار و اقارب و دیگر اور شناسا و ڈھیر سارے لوگ
بعد تدفین تمام لوگ ابھی، ایک ایک کر کے جا چکے تھے
اب وہ تھا اکیلا.....سدا کے لیے اکیلا.....
تنگ سی اس قبر کے اندر وہ، بول سکتا نہ ہل ہی سکتا تھا
ہڈیاں تک بھی اس کی گل سڑ کر، ساری مٹی میں مل ہی جائیں گی
پر وہ کیا چیز تھی جو اس میں ابھی، باقی رکھتی تھی قوتِ احساس
ہوتی تھی گر کوئی آواز، کوئی چلتا تھا، بولتا یا کوئی پاس سے گزرتا تھا
اس کو احساس ہوتا رہتا تھا
اور کوئی قوت اب سوا اس کے، ذرہ بھر بھی بچی نہیں تھی کہیں
اب نہ وہ جھوٹ بول سکتا تھا، نہ چھندر سکتا تھا کسی سے، ٹھگ نہ سکتا تھا چھل کپٹ سے بھی اب کسی کو
زندگی میں تو کتنی چالاکی، جھوٹ، دھوکہ دھڑی و بے ایمانی، بدعملی و بربریت بھی اور نا جانے، مظالم
اکثر ہی کرتا رہتا تھا کیسے کیسے؟
اور.....بعدِ مطلب وہ ایسا بن جاتا، جانتا ہی نہیں ہو جیسے کچھ
پھر پسِ پشت کی تو بات ہے کیا، منھ در منھ کتنے لوگوں کو، وہ بھی سچے لوگوں کو، نہ صرف جھٹلا دیتا تھا بلکہ،
الٹے الزام تھوپ دیتا تھا ان پر
سام، دام، دنڈ، بھید، یہ بھی، عمل کرتا تھا ہر غلط ڈھنگ سے

بہت ہی تیز رفتار بھی تھا وہ، اور اپنے تمام کاموں میں، چست و چالاک سمجھا جاتا تھا۔

کام کتنا بھی بدترین ہوکوئی، اس کو پرواہ کبھی نہ ہوتی تھی، سب تمیزوں سے تھا وہ بے بہرہ۔

گنہ ثواب ہو، اچھائی یا برائی ہو، کھوکھلے ہیں جھمیلے سوچتا تھا وہ، اوران میں نہ پڑتا تھا بالکل۔

طرح طرح کی بدی ونیکی کی داستانیں سنی بہت تھیں ہمیشہ اس نے۔ کبھی انھیں میں سے کتنی باتیں تو پہلے لگتی تھیں اس کے دل کو۔ پر اب وہ جیسے نئے زمانے کی تلخیوں سے گزر گیا تھا، وہ پتھر ہوتا چلا گیا تھا۔

تمام دنیا کی اچھی باتیں اب اس کو لگنے لگی تھیں بیکار

اسے یہ محسوس ہوگیا تھا کہ لوگ مطلب کے واسطے ہی تو ایسی باتوں کو اپناتے واستعمال کرتے ہیں اور کچھ بھی نہیں..... چنانچہ اب وہ بھی نیکیوں کو، سمیٹ لینے کو مال ودولت، ہنر سمجھ کر عمل میں لاتا۔ خیال اس کا یہ تھا، کسی بھی بڑے شہر میں، علاوہ اس کے دھرا ہی کیا تھا

پر اب وہ اندر کی آواز سن رہا تھا

اور اپنے بھیتر وہ دیکھ سکتا تھا سارا منظر

نہ اب کوئی دوست رہ گیا تھا، نہ دولت وثروت و تزک واحتشام باقی، نہ اولاد تھی نہ عیش وطرح طرح کی جولذتیں تھیں۔ وہ بے ضمیری بھی سانس کے سنگ، جیسے کب کی چلی گئی تھی، اوراب تو کچھ بھی نہ رہ گیا تھا۔ بس اب تھا احساس اور ضمیر اس کا۔ لیکن موت..... تمام عمر کی وہ گمرہی کا، آخری واقعہ تھا..... اور تھا واقعہ وہ.....

''عفان اوراس کے پارٹنر نے کچھ دنوں پہلے ان لوگوں نے اپنے آفس کے لیے کلرکس اور پی۔اے۔ کی نوکریاں نکالی تھیں۔ وہ اکثر ایسا کرتے تھے سوامیدوار لڑکے لڑکیاں آتے رہتے تھے۔ اس طرح وہ لڑکیاں چھانٹتے تھے اور انٹرویو کے دوران کچھ سوالوں کے ذریعے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کرتے تھے کہ کون سی خوبصورت لڑکیاں رضامندی سے ان کے کل کاموں میں آسکتی تھیں۔ جن کمپنیوں اور پارٹیوں سے انھی بڑے بڑے کام ملتے تھے، جن کے ٹنڈر بھرے جاتے تھے، ان کے منیجروں اور مالکوں کو کونسی لڑکیاں خوش کرسکتی تھیں۔ عفان اپنی جگہ سے اُٹھا اور برآمدے کا جائزہ لینے والے سوراخ سے جھانک کر دیکھا۔

''کیا بات ہے؟ جواب نہیں؟'' کئی لڑکیوں اورلڑکوں میں ایک لڑکی بے حد حسین وجمیل تھی۔

انٹرویو شروع ہوا، ایک کے بعد ایک لڑکے لڑکیاں بلائے جانے لگے، انٹرویو کے آخر میں ہر ایک سے کہہ دیا جاتا تھا'' آپ مطمئن رہیے، آپ کی ای۔میل۔آئی۔ڈی اور موبائل پر آپ کو اطلاع دے دی جائے گی۔''

ہر ایک خوشی خوشی واپس ہو جاتا تھا کہ انٹرویو بہت اچھا ہوا ہے۔

مذکورہ لڑکی کو آواز لگی ''مس روحی۔''

''مے آئی کم ان سر'' روحی بڑے اسٹائل سے پرتبسم چہرے کے ساتھ آفس میں داخل ہوئی۔

''یس کم ان'' عفان بولا اور اس پیکرِ حسن کا سرتا پا جائزہ لینے لگا۔ انٹرویو شروع ہوا۔ چند سرسری سوالوں سے آگے جب نازک سوالوں کا سلسلہ شروع ہوا تو لڑکی ان کی امیدوں کے خلاف انتہائی بے باک ثابت ہوئی۔ جن باتوں کو وہ بڑی احتیاط سے پوچھا کرتے تھے، ان کے جواب وہ بڑی کشادہ مسکراہٹ کے ساتھ دے رہی تھی۔ تمام معاملات جلد ہی طے ہوگئے۔ عفان اور نواب دونوں بہت خوش تھے کہ کیا چیز ہاتھ لگی ہے؟ ایسی خوبصورت اور سب کچھ کرنے کو تیار ہے، وہ بھی خوشی خوشی۔ واہ کیا بات ہے؟ مزہ آجائے گا۔''

روحی دو بھائیوں کی اکیلی چھوٹی بہن تھی۔ دونوں بھائی شادی شدہ۔ ماں دوسال پہلے گزر گئی تھیں۔ روحی ابھی ایم۔ایس۔سی کے پہلے سال میں ہی تھی کہ چند روز پہلے باپ کو گردوں کی کچھ شکایت ہوئی۔ ڈاکٹروں نے جانچیں کرائیں تو معلوم ہوا کہ دونوں گردے بیکار ہو چکے ہیں۔ یہ معلوم ہوتے ہی روحی کے تو جیسے ہوش اُڑ گئے۔ اب باپ ہی اس کا اکلوتا سہارا تھے۔ اس نے اپنا گردہ باپ کو دینا چاہا لیکن کچھ ٹیسٹ ہونے کے بعد بتایا گیا کہ وہ سوٹ نہیں کرے گا۔ اس کے ایک بھائی نے اپنی کڈنی دینی چاہی؛ لیکن اس کی بیوی آڑے آگئی۔ دوسرا تو پہلے ہی ہچکچا رہا تھا۔ روپئے کی بھی کافی کمی تھی۔ روحی نے دوڑ دھوپ کرکے بالآخر ایک آدمی کو گردہ دینے کے لیے راضی کرلیا۔ اس کے ٹیسٹ کرائے گئے۔ گردہ میچ کررہا تھا؛ لیکن مشکل یہ تھی کہ وہ آدمی پانچ لاکھ روپئے مانگ رہا تھا۔ اس آدمی کی بھی کوئی دشواری تھی جس کی وجہ سے اسے ہر حالت میں جلد ہی پانچ لاکھ روپئے درکار تھے۔ دونوں بھائی تو مل کر بھی دو لاکھ روپئے مہیا کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ ادھر کڈنی کے علاوہ ٹرانسپلانٹیشن کا بھی ایک بڑا خرچ تھا۔ روحی تہیّہ کرچکی تھی کہ کچھ بھی ہوجائے وہ باپ کی جان بچانے کی ہر صورت سے کوشش کرے گی۔ وہ جان بوجھ کر زندگی کو کسی غلیظ دلدل میں گرا دینا تھا۔ اس کے پاس روپیہ حاصل کرنے کا کوئی دوسرا طریقہ نہیں تھا اس کے پاس۔ دوسری صورت میں باپ کی زندگی سے ہاتھ دھوسکتی تھی۔ وہ بچپن ہی سے باپ سے بے اندازہ محبت کرتی تھی۔ تاہم ''ہاں اور نہ'' کی ایک لڑائی تھی جو اس کے اندرون میں چل رہی تھی۔ تبھی اس کے موبائل پر ایک کال آئی۔

''یس سر! بول رہی ہوں، جی سر..... بہتر ہے۔ میں پہنچ جاؤ گی۔ آپ بے فکر رہیے، آپ کو کوئی شکایت نہیں ہوگی..... اکاؤنٹ میں روپئے ڈلوا دیئے سر؟ کتنے؟ کل تیسرے پہر سے پہلے پورے ڈلوا دیجیے گا۔ پلیز سر..... تھینک یو..... تھینک یو سو مچ سر.....''

شہر کا ایک مشہور بزنس مین ڈی۔ایل۔ انٹر پرائزیز کمپنی کا مالک اپنے دفتر کی لمبی چوڑی عمارت میں اپنے ایک دوست عفان سمیت زہریلی شراب پی کر مرگیا تھا۔ عمارت کے باہر لوگوں کا جم غفیر تھا۔ لوگ طرح طرح کی چہ می گوئیاں کررہے تھے، پولیس کا انتظار ہورہا تھا، کچھ دیر بعد پولیس آگئی۔ بھیڑ کو ہٹایا جانے لگا۔ پولیس کارروائیاں ہونے لگیں۔ شراب کے برتنوں، بوتلوں کی جانچ شروع ہوگئی۔ بچی کھچی شراب کے سیمپل تیار کئے

جانے لگے۔ شراب کہاں سے آئی تھی؟ جو نمکین، چکن وغیرہ ٹیبل پر موجود تھا، وہ کہاں کہاں سے آیا تھا؟ موقع پر اور کوئی تو نہیں تھا؟ کیا کوئی نوکر ڈیوٹی پر تھا؟ اگر نہیں تھا تو کیوں نہیں تھا؟ کئی گھنٹے تک پولیس اپنی کارروائیاں کرتی رہی۔ بعد کو لاشیں پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوادی گئیں۔

ایک سب انسپکٹر نے شیشے کی ایک ڈاٹ لگی ہوئی چھوٹی سی ٹیوب ڈسٹ بن سے نکالی تھی۔ انچارج انسپکٹر کو اس نے وہ ٹیوب دکھائی؛ لیکن انسپکٹر نے اسے کوئی اہمیت نہیں دی۔ سب انسپکٹر نے وہ ٹیوب پالیتھن میں لپیٹ کر جیب میں ڈال لی۔ وہ اسے نظر انداز کرنے کو تیار نہیں تھا۔ اسے یاد نہیں آرہا تھا کہ اس نے ایسی ٹیوبس کہاں دیکھی تھیں؟ وہ انچارج کا ساتھ بھی دے رہا تھا اور اپنی سوچ کے مطابق علیحدہ سے اکیلا بھی دوڑ دھوپ کرنے لگا۔ کئی دن ہوئے روحی کے باپ کی کڈنی کا ٹرانسپلانٹیشن ہو چکا تھا۔ اب وہ اچھی حالت میں تھے۔ ہسپتال کے ڈاکٹرس اسے بہت کامیاب کیسز میں شمار کررہے تھے۔ روحی خوش بھی تھی اور فکرمند بھی۔ وہ برابر کچھ سوچتی رہتی تھی۔

''کیا بات ہے بیٹا؟ تم پوری طرح خوش نہیں دکھائی دیتیں۔'' باپ پوچھتے۔

''کوئی بات نہیں پاپا۔ میں بہت تھک گئی ہوں۔'' وہ پھیکی سی مسکراہٹ سے کہہ دیتی۔

''تم نے یہ نہیں بتایا کہ تم نے اتنی بڑی رقم کا انتظام کیسے کیا؟'' باپ ایک بار پہلے بھی یہ سوال کر چکے تھے۔ جبکہ کڈنی دینے والے کو کیا دیا گیا تھا؟ کسی کو پتہ نہیں تھا۔ روحی نے یہ بات کسی کو نہیں بتائی تھی۔ وہ سب صرف ڈاکٹروں اور ہسپتال کے خرچ سے ہی واقف تھے۔

''بتادوں گی پاپا، پہلے آپ بالکل اچھے ہوجائیں، آپ جانتے ہیں کہ آپ کی بیٹی جب جو صحیح سمجھتی ہے، وہی کرتی ہے۔ آپ پریشان نہ ہوں۔'' روحی نے یہ کہہ کر ٹال دیا۔ کتنے ہی دنوں سے روحی اپنی تعلیم کی طرف بالکل توجہ نہیں دے پائی تھی۔ کچھ حالات اور کچھ اپنی ذہنی الجھنوں کی وجہ سے۔ آج وہ اپنی ایک کلاس میٹ سے ملنے کے لیے گھر سے نکلی تھی۔ دھیرے دھیرے سوچوں میں گم چلی جارہی تھی کہ ایک پکی عمر کا آدمی اس کے برابر سے چلنے لگا۔ اس سے قبل کہ وہ اس پر توجہ دیتی وہ بول پڑا۔

''میں سب انسپکٹر امر سنگھ ہوں، گھبرائیے مت! چلتی رہیے۔ دونوں شرابیوں کی مرتیو کے بارے میں چھان بین کررہا ہوں۔ اس سمے میں اپنی اور سے آپ سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔ کیا ہم کہیں بیٹھ سکتے ہیں؟'' وہ سادہ کپڑوں میں تھا۔ ''جج... جی آیئے۔ پر مجھ سے کیوں؟'' روحی اسے ایک مال میں لے گئی جہاں کچھ بنچ نما کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ اندرونی طور پر روحی کی حالت غیر ہونے لگی تھی۔

''دیکھیے میں آپ کے بارے میں بہت کچھ جان چکا ہوں۔ آپ کا نام روحی ہے۔ آپ کیمسٹری میں ایم۔ ایس۔ سی کررہی ہیں۔ آپ کو اپنے پتا کی کڈنی بدلوانے کے لیے روپئے کی ترنت آوشیکتا تھی۔ عفان نے آپ کے اکاؤنٹ میں مرتیو سے ایک دن پہلے دو لاکھ روپئے ڈلوائے تھے۔ آدی اور بھی بہت کچھ۔'' وہ کہہ رہا تھا۔ ''دو لاکھ روپیے! کس نے کہا آپ سے؟ اور میرا کسی عفان سے کیا مطلب؟ کون عفان؟'' روحی بے حد گھبرا چکی تھی لیکن حواس نہیں کھوئے تھے۔ ''دیکھیے! یہ پوچھ تاچھ میں آپ کو تھانے بلوا کر بھی کرسکتا ہوں۔ ''ٹھیک ہے، پوچھئے جو پوچھنا ہے۔'' روحی روہانسی آواز میں بولی۔ وہ ٹوٹ رہی تھی۔

وہ شیشے کی ایک چھوٹی سی ٹیوب دکھا کر کہنے لگا ''یہ مرت لوگوں کے نکٹ ڈسٹ بن میں ملی تھی۔ جانچ سے پتہ لگا کہ جو وش اس ٹیوب میں تھا وہی شراب کی بوتل اور گلاسوں میں پایا گیا۔ آپ کی کیمسٹری لیب میں اس طرح کی خالی ٹیوبس موجود ہیں۔'' روحی پر لرزہ طاری ہوگیا۔ وہ رونے لگی، کچھ دیر روتی رہی پھر لرزتی ہوئی آواز میں ہی کہانی سنانی شروع کی۔ ''جب میں وہاں پہنچی تو سیٹھ عفان سے کہہ رہا تھا کہ تیرا ٹینڈر کل ہی پاس ہوگیا تھا، تیس پیٹی تو تو ابھی لے جانا باقی دھیرے دھیرے ملتے رہیں گے۔ بے فکری کے ساتھ کام کر۔ مجھے دیکھ کر پہلے تو وہ للچائی ہوئی نظروں سے گھورتا رہا پھر دونوں نے شراب پی اور میرے کپڑوں پر ہاتھ ڈالنے لگے تو اچانک میرا ضمیر جاگ گیا۔ زہر تو میں کچھ روز پہلے، جب چھوٹے بھیا اور بھابی نے، ذرا سی بات پر مجھے بہت برا بھلا کہا تھا تو غصے میں خودکشی کے لیے لائی تھی جو میرے بیگ میں پڑا ہوا تھا۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ میں ان دونوں کے بیچ گھر چکی ہوں۔ شاید بچ کر نہ نکل پاؤں تو میں نے ان سے کہا کہ تھوڑا صبر کیجیے۔ میں کہیں بھاگی تھوڑے ہی جارہی ہوں، کچھ میرے ہاتھ سے بھی پئیں۔ تھوڑی میں بھی پیوں گی۔ دونوں اور خوش ہوگئے اور میں نے انھیں شراب پلائی اور خود بھی جھوٹ موٹ پینے لگی۔ جب وہ غافل ہوگئے تو میں نے چابی تلاش کی۔ ملنے پر اپنی ضرورت کے مطابق سیف سے رقم نکالی پھر سیف بند کر کے چابی جگہ پر رکھی۔ اپنا گلاس خالی کر کے اپنے بیگ میں ڈالا اور باہر نکل آئی۔ اس ٹیوب پر میرا دھیان نہیں گیا۔

''میری ایک بوا تھی، بہت سندر۔ آپ کی طرح۔ میں چھوٹا تھا۔ دادا جی کی بیماری کے کارن وہ گاؤں کے چودھری سے اپنی مزدوری میں سے کٹوا کٹوا کر جمع کیے ہوئے روپئے مانگنے چلی گئی تھی۔ روپئے تو وہ لے آئی تھی کنتو کچھ ہی دنوں بعد اس نے آتم ہتیا کر لی تھی۔ دادا جی بھی نہیں بچے تھے۔ آپ کی کہانی سن کر مجھے بوا یاد آگئی۔ وہ مجھے بہت پیار کرتی تھی۔ آج بھی جب کبھی میں اس چودھری کو دیکھتا ہوں تو میرا کھون کھول اُٹھتا ہے۔ پر..... یہ کہتے ہوئے سب انسپکٹر نے دوسری طرف منہ کرلیا۔ وہ بیک پاکٹ سے رومال نکال کر شاید اپنی آنکھیں پونچھ رہا تھا۔

روحی حیرت سے اسے تک رہی تھی۔ ''آپ کا دکھ، مجبوری، آپ کی انتر آتما، ساہس، سب اپنی جگہ کنتو دو ہتھیائیں ہوئی ہیں، اپنے پتا کا جیون بچانے کے لیے آپ نے دو ہتھیائیں اور چوری کی۔ یہ گھورا پراد ہے۔ اتنی اچھی لڑکی ہوتے ہوئے آپ نے اتینت ''بُری عورت'' جیسا کاریہ کیا۔ یہ سن کر روحی نے اپنا سر جھکا لیا۔

❑❑❑

خوار مسیحا

شبنم پروین

افسانہ نویس

جے.این.یو.میں ریسرچ اسکالر

تحقیق کا موضوع

'اردو کی نئی بستیوں میں شاعرات

کے فکر وفن کا تنقیدی جائزہ'

وطن لکھیم پور

320، کوئنا ہاسٹل، جے این یو، نئی دہلی

رابطہ: 9811731888

مرزا شرافت علی بیگ کا مکان گاؤں کے بیچ وبیچ میں واقع تھا، وہاں سے بازار، ہاٹ، مسجدیں، تراہے اور چوراہے سبھی کچھ نزدیک پڑتے تھے اسلئے رشتہ داروں اور مہمانوں کو زیادہ راحت ان کے گھر ٹھہرنے میں محسوس ہوتی۔ مرزا شرافت علی بیگ کو ان کی نرم مزاجی، ہمدردی اور ملنساری کی وجہ سے لوگ پیار سی ''شرفوا'' کہہ کر بلانے لگے تھے، شرفوا نماز روزے کا بہت پابند تھا، دین داری، مہمانوازی اور غربا پروری اس کی فطرت میں شامل تھیں۔ کوئی بیمار ہوتا، کسی غریب کی بیٹی کی شادی ہوتی یا پھر کوئی دیگر لین دین ہوتا شرفوا ان سب معاملوں میں پیش پیش رہتا۔ انسان دوستی اور خیراتی جذبوں کی تکمیل وہ اپنے کپڑوں کی چھوٹی سی تجارت سے کرتا تھا۔ آٹھ دس نفوس پر مشتمل اسکا بھرا پورا گھر ''سکھی پرواز'' کی نوعیت رکھتا تھا۔ ''انسان انسان ہے فرشتہ نہیں'' والی بات تو تسلیم شدہ ہے، انسانی وجود خامیوں اور خوبیوں کا مجموعہ ہوتا ہے، ہاں وہ الگ بات ہے کہ کس پر کس کو ترجیح دی جائے۔ شرفوا کی خامیاں کچھ زیادہ نہ تھیں لیکن عداوت تجارت سے خاص تھی۔ جس کی بنیاد پر اس کی تمام خوبیوں کو عزیز واقارب، ہمدم ودوست جن کے لئے وہ ہر وقت بے دام غلام بنا رہتا چند خامیوں تلے دبا دیتے۔ اس کی فطری برائیاں بھی کچھ ایسی نہ تھیں۔ ازراہِ تفریح اور وقتی طور پر وہ کوئی بات کہہ دیتا۔ بعض جگہوں پر خود کو کمزور پاتا مثلاً بڑی عجلت اور سرعت سے فیصلے لے لیتا، کسی بھی چیلینجنگ کام کا ذمہ سنبھال لیتا اور زود گوئی کی عادت بھی مجبوری تھی۔ یہ سب چیزیں اس کے ساتھ لازم وملزوم کی صورت رکھتیں۔ جس کی بنیاد پر اکثر اُسے مختلف مسائل سے جوجھنا پڑتا۔ اس کے تمام یار دلدار بظاہر بڑے سنجیدہ اور پر وقار دیکھنے میں لگتے لیکن اندر سے ''بدلو رام پلٹو داس'' کی سی سرشت رکھتے تھے۔ ہر معاملے میں ساتھ رہتے، لیکن کوئی بھی موقع اس کو نیچا دکھانے کا ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔ گاؤں میں شرفوا کی برادری نہ کے برابر تھی، جس میں وہ تنہا تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے سب پر سبقت پر رکھتا تھا۔ اکثریتی طبقہ کو اس کی اسمارٹنیس اور فیاضی پھوٹی آنکھ نہ بھاتی، ملنے ملانے کے خوب سلسلے چلتے، قیام وطعام کے مواقع بھی اکثر آتے لیکن اخلاص نام کی چیز سے سبھی کورے تھے۔ یہ سچ ہے کہ احباب چاہے کتنی ہی متاثر کن گفتگو کیوں نہ کرلیں اگر وہ خلوص اور محبت سے عاری ہے تو قطعی دل پر اثر نہیں کرسکتی۔ شرفوا اپنے دوستوں کی لگاوٹوں اور مصنوعی باتوں کو سچ سمجھ کر ان سے رشتے ہموار رکھتا۔ جبکہ اس کے خلاف پلاننگ کی جاتی، پیٹھ پیچھے لعن طعن ہوتا،

موقع غنیمت جان کر اپنے قصیدے اور اسکی ہجو کا محفلوں میں بیان ہوتا۔اس کی ایک ایک نقل وحرکت پر نہ صرف نظر رکھی جاتی بلکہ کبھی بزنس تو کبھی شخصیت کو داغ دار کرنے کے حربے اپنا ئے جاتے۔ شرفوا سارے معاملات خدا پر ڈال کر اپنی راہ پر گامزن رہتا۔کئی بار تو اُسے جھوٹے معاملوں میں پھنسانے کی کوشش بھی کی گئی،کبھی باہر اور اکثر اس کی ازدواجی زندگی میں انتشار ڈال کر لوگوں نے خوب مزے لئے۔شرفوا ہر بار اپنے وجود کو شکستہ ہونے سے بچاتا رہا۔ نیرنگئ قسمت دیکھئے کہ ایک نئ اور بڑی آزمائش اس کے انتظار میں تھی۔ہوا کچھ یوں کہ زندگی کی ٹیڑھی میڑھی راہوں پر چلتے چلتے اس کی ملاقات ریحانہ نامی ایک ایسی لڑکی سے ہوگئ جسے معاشرتی بالادستی نے اندر سے بہت توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔اس کی آرزوؤں اور تمناؤں کے محل مسمار ہوچکے تھے۔ حسرتوں کے گھنیرے بادل امڑ امڑ کر فضا میں معدوم ہوتے ہوئے اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے۔اس کا وجود اب اپنے آپ میں ایک بوجھ کی مانند تھا سر پہ کسی سایۂ سحاب اور محافظ نہ ہونے کی وجہ سے وقت کی آندھیاں اس کے ادھورے کمزور اور نحیف سے وجود پر مسلسل یلغار کرتی رہیں ، بکھیرتی سمیٹتی رہیں ۔ وہ اپنے زندہ رہنے اور سانس لینے کا مقصد بے معنیٰ سا محسوس کرنے لگی تھی ۔ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بہت ہوتا ہے، ایسی صورت حال میں ایک مضبوط ہاتھ اور ساتھ کی ضرورت تھی۔ جو اس کے تاریک پس منظر کی ویرانی کو اپنی وفاؤں کی قندیلوں سے روشن کردے۔پیش منظر کی راہوں کے سرے خوشیوں کے تاروں سے جوڑ دے۔ اپنی شفقتوں کی شیرینی سے اس کے وجود کو نمو بخشے۔

شاید قدرت نے قسمت سے شرفوا جیسے مسیحا سے ملوایا تھا۔کیونکہ وہ جہاں پہ رہتی تھی ادھر لوگوں کا گزر بہت کم تھا۔گاؤں کے کنارے،ایک چھوٹی سی مسجد زیر تعمیر تھی،جس کے جنوب میں ایک جھوپڑی نما گھر میں وہ مقیم تھی۔کسی کو کچھ پتہ نہیں تھا کہ وہ کون ہے،کہاں سے آئی ہے،کیوں آئی ہے،اور کب آئی ہے،اس کا پورا نام کیا ہے،اس کا خاندانی پس منظر کیا ہے۔آس پاس کے لوگ اُسے ریحانہ کے نام سے جانتے تھے ۔وہ چند برسوں سے اس جگہ پہ رہ رہی تھی۔اس کی عمر لگ بھگ پچیس سال سے زائد نہ ہوگی ۔غربت اور مفلسی کی مار سہنے کے باوجود بھی بات چیت کرنے میں تحکمانہ لب و لہجہ ، لمبا قد اور گورا چٹا رنگ اس کی شباہت سے اندازہ لگانا ذرا بھی دشوار نہ تھا کہ کسی اچھے

خاندان سے رہی ہوگی ۔کھنڈر دیکھ کر عمارت کی عظمت کا اندازہ آسانی سے لگایا جاسکتا ہے۔ہونی کو کون ٹال سکتا ہے،شرفوا کا گزر ایک دن اُسی چھور والی مسجد میں ہوگیا۔اس کے صاف ستھرے کریز لگے کپڑوں کو دیکھ کر' ریحانہ' کے من میں اچانک اس سے بات کرنے اور مدد مانگنے کا خیال گردش کرنے لگا۔اس کی طرف پکارتے ہوئے لپکی۔

''بابو جی!اے بابو جی!''

ریحانہ نے شرفوا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ شرفوا نے جب پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ حیران رہ گیا، میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس حسن وحیا میں لپٹی ہوئی ایک خوبصورت سی لڑکی آواز لگا رہی تھی ۔اپنی دوشیزگی پر پڑی الجھی ہوئی بھٹکی بھٹکی زلفوں کی بے ترتیبی کو سنوارتے ہوئے اُسے التجا بھری نظروں سے دیکھے جا رہی تھی۔مجبوریوں اور پریشانیوں میں بھیگا ہوا لہجہ خود بتا دیتا ہے کہ پریشان آنکھوں کی خواہش کیا ہوتی ہے۔

''شرفوا.....جی آپنے مجھ سے کچھ کہا؟''۔سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ریحانہ ،نے آہستگی سے ہاں میں سر ہلایا۔''شرفوا....غور سے اس کی طرف دیکھ کر،فرمایئے''

ریحانہ ،نظریں جھکائے ہوئے لجاجت اور شرمندگی کے ساتھ اس سے کہہ رہی تھی۔

''بابو جی !مجھے کوئی کام دے دیجئے''۔''میں بھکارن نہیں ہوں ،محنت مزدوری کرکے اپنا پیٹ پالنا چاہتی ہوں۔''

''شرفوا تعجب سے،کون سا کام؟اور کیسا کام؟''

''ریحانہ''میں گھریلو سارے کام کر لیتی ہوں'' پانچویں جماعت پاس بھی ہوں''۔

''شرفوا....تمہارا نام کیا ہے؟ کہاں رہتی ہو؟ گھر میں اور کون کون ہے ؟''۔''بھائی باپ کیا کرتے ہیں؟'' آگے کی پڑھائی کیوں نہیں کی''؟۔

شرفوا نے ریحانہ سے ایک ساتھ کئی سوال کر ڈالے،ریحانہ نے اپنا نام بتانے کے ساتھ ساتھ اپنی تمام آپ بیتی کھلی کتاب کی طرح سے اس کے سامنے رکھ دی۔

ر یحانہ نے اپنی جھوپڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا،''بابو جی یہی میرا گھر ہے،جس میں اپنی بوڑھی بیمار ماں کے ساتھ رہتی ہوں،جب تک ماں سہی سلامت رہی محنت مزدوری کرکے ہم دونوں کا پیٹ پالتی رہی اب وہ بیمار پڑی ہے اس کے لئے دوا

داروتو دور کی بات دو وقت کی روٹی کے لالے پڑے ہوئے ہیں،اور میرا کوئی نہیں ہے !!''شرفوا کے تمام کہے ان کہے سوالوں کے جواب ریحانہ نے ایک ساتھ ہی دے دیئے تھے۔شرفوا دیر تک اس کی کسم پُرسی ،لاچارگی، بےبسی اور درونِ خانہ اٹھتی کرب کی لہروں کو محسوس کرتا رہا۔

''شرفوا....اچھا یہ بتاؤ تم آگے کی تعلیم حاصل کرنے کی خواہش رکھتی ہو؟'' ریحانہ نے اس کی طرف حیرت اور متعجب نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا''ہاں مگر کیسے....؟'' پڑھائی کے لئے تو پیسے چاہئے ،وہ کہاں سے آئیں گے؟اور ہم دونوں ماں بیٹی کا پیٹ کیسے چلے گا....؟''۔

''شرفوا....خدا پر بھروسہ رکھو وہ بڑا کارساز ہے، سب انتظام انشاءاللہ ہوجائے گا''۔''میرا نام شرافت علی بیگ ہے، بازار والی گلی میں مسجد کے سامنے میرا گھر ہے۔اس سے تھوڑا آگے چل کر ایک انٹر کالج ہے،اس میں تمہارا داخلہ کرادونگا اور تمہاری ماں کا علاج سرکاری اسپتال سے مفت ہوجائیگا''۔

ریحانہ پلکیں جھپکائے بغیر اُسے ایک ٹک دیکھے جا رہی تھی ۔شرفوا کا مشفقانہ انداز اور جذباتی لہجہ سے وہ خود میں ایسی سرخوشی محسوس کرنے لگی کہ جیسے کوئی آسمانی فرشتہ اس کے خوابوں کی تکمیل کے واسطے زمین پر اُتر آیا ہو اور اس نے ایک ہی پل میں سب کچھ پالیا ہو۔

''اور کھانا خرچہ....؟''۔

ریحانہ نے زندگی کا آخری بنیادی سوال بھی اس کے سامنے رکھ دیا۔''اس کی فکر مت کرو،منھ دینے والا پیٹ کی خبر بھی رکھتا ہے''۔ خدا پر بھروسہ رکھو ۔شرفوا نے چند منٹوں میں اس کے سارے مسائل حل کردئے تھے۔

''شرفوا....میں تمہیں اسکول سے وظیفہ دلانے کی کوشش کرونگا ،اس کے علاوہ خالی وقت میں تم دوسرے کام مثلاً سلائی کڑھائی وغیرہ کرتی رہنا بس سب چلتا رہے گا''۔ہاں!تمہیں نے بتایا ہے کہ گھریلو سارے کام کرنے آتے ہیں پھر؟۔''

مدّتوں بعد ریحانہ کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی ۔اُداسیوں کے سائے چھٹتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔حسین خوبصورت خوابوں کی دنیا خیالوں میں رقص کرنے لگی تھی ۔اُسے اپنے وجود میں شبنم کی سی ٹھنڈک کا احساس ہو رہا تھا۔زندگی کے جمود کو اپنی شفقتوں کی گرمی سے ڈھانپ کر اس کی مسیحائی نے موت سے بچا لیا تھا۔دن مہینے سال میں

گزرتے رہے ریحانہ کی تعلیم اپنے مدارج طے کرتی رہی،ماں کی طبیعت میں درستگی آگئی اور سلائی کڑھائی کے معمولی سے کام نے باقاعدہ روزگار کی صورت اختیار کر لی تھی ۔جس میں ریحانہ جیسی بہت سی لڑکیاں اپنے لئے زندگی جینے کے بہانے تلاش کرنے لگی تھیں۔ ادھر شرفوا کے خیر خواہ دوستوں کو جب اس بات کا علم ہوا تو وہ اس صدمہ سے جاں بر نہ ہوسکے۔وہ طوفانِ بدتمیزی اور واویلا مچایا کہ ساری حدیں پار ہوگئیں، ذلیل وخوار کرنے کا کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا۔سارے اپنے اپنے نقلی مکھوٹوں سے باہر نکل پڑے۔ریحانہ کو اس کے دوستوں کے بارے میں کچھ پتہ نہیں تھا اور نہ ہی اس نے پہلے کبھی ان میں سے کسی کے نام ہی سنے تھے لیکن ان لوگوں کی شر پسندی کا اندازہ اسے تب ہوا جب شرفوا کے ساتھ ساتھ اپنے نام کی تشہیر بھی دیکھی۔

ریحانہ کو شرفوا ہمیشہ آگے بڑھنے کی ترغیب دیتا اور یہی سمجھاتا کہ یہ دنیا ہے،'' کچھ تو لوگ کہیں گے ،لوگوں کا کام ہے کہنا'' رفتہ رفتہ ریحانہ اور شرفوا بہت اچھے دوست بن گئے ۔ان کی یاری رشتہ داری میں تبدیل نہ ہوسکی۔حالانکہ لوگوں کے ذہن شک کی بنیاد پر ہی مفلوج ہوگئے تھے۔پھر ایک دن وہ آیا جب شرفوا نے ریحانہ کی شادی بڑے دھوم دھام سے کردی ،لیکن ان کے بےغرض اور بےضرر رشتے اب پہلے سے بھی زیادہ مضبوط ہو گئے تھے۔ بدنامیوں اور رسوائیوں کی کھڑی اونچی فصیلوں کو جذبوں کی صداقتوں اور مخلصانہ رفاقتوں نے ڈھا دیا تھا۔کسی نے کیا خوب کہا ہے''دل کو دل سے راہ ہوتی ہے''،اور''جہاں چاہ وہاں راہ''۔خلوص کی خوشبو دلکش ہوتی ہے، چاہے بانٹی جائے یا وصول کی جائے۔دو انجان اب دو خاندانوں میں تبدیل ہو چکے تھے۔نیکی اور انسان دوستی اپنی راہیں آپ بنالیتی ہیں۔شرفوا ریحانہ کو اس کی منزل مقصود تک پہونچا کر خود کو ہلکا سا محسوس کرنے لگا تھا۔اپنے تمام دوستوں سے اس نے کبھی کسی طرح کا کوئی گلہ شکوہ نہیں کیا بلکہ انکساری ،خاکساری اور رحمدلی کے جذبہ سے پیش آتا رہا،اس کے برتاؤ میں کچھ فرق نہ آیا۔

زمانے کی ستم ظریفی اور اپنی سادگی پر وہ اکثر یہ شعر گنگناتا رہتا:

اسے اب سادگی کہئے کہ حد عاشقی کہئے
ترے ہاتھوں میں جو پتھر تھے ان کو پھول ہی جانا

❑❑❑

سود و زیاں کی کشمکش میں جاگیرداری نظام نے دم توڑ دیا

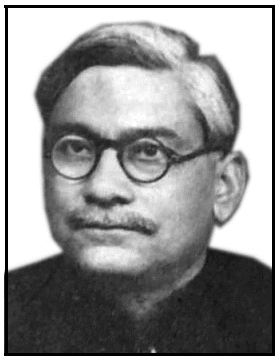

مرزا جعفر حسین

معروف ادیب و مورخ

شاہان اودھ کے لکھنؤ کی

تہذیبی، سماجی، ثقافتی اور

زوال پذیر تاریخ کے مستند مورخ

پیدائش: ۱۸۹۹ء

وفات: ۱۹۸۹ء

فرمانروایان اودھ کی جانب سے عطا کردہ کثیر تعداد میں جاگیریں اور جائدادیں رؤسا و عمائدین اور شرفائے لکھنؤ کے قبض و تصرف میں تھیں۔ دربار سے منسلک وزرا اور دوسرے مقربین کے خاندان کافی خوش حال تھے۔ لکھنؤ والے کے لئے دن عید اور راتیں شب برات تھیں۔ عشرت و شادمانی میں در و دیوار سرشار تھے۔ ناگہاں انتزاع سلطنت نے سارا نظام زندگی درہم و برہم کر دیا۔ فوجوں نے مداخلت کی اور انگریزوں کی جارحیت کا مقابلہ کیا لیکن یہ نابرابری کی جنگ زیادہ مدت تک نہیں چل سکی اور انگریزوں کا تسلط ہوا۔ انہوں نے سب سے پہلے انتقام لینے کی کارروائی شروع کی۔ جتنے رؤسا و عمائدین اور دوسرے منصب دار مقاومت کرنے والی فوج اور بیگم حضرت محل کے طرف دار سمجھ گئے ان کی جاگیریں اور جائدادیں ضبط ہوئیں۔ بعض جلیل القدر ہستیاں اتنی تباہ و برباد ہوئیں کہ ان کے پاس رات بسر کرنے کے لئے ٹھکانا بھی باقی نہیں رہا تھا۔ مکانات مسکونہ تک ضبط کر لئے گئے تھے۔ اسی پر اکتفا نہیں ہوئی، ان خاندانوں کو بھی سزا ملی جن کے بزرگ ایسٹ انڈیا کمپنی کا اعتماد کھو چکے تھے۔ مثال کے طور پر خان علامہ نواب تفضّل حسین کے خانوادے کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ دربارِ شاہی کی جانب سے خان علامہ کو ضلع ہردوئی میں بہت سے مواضعات جاگیر میں ملے تھے۔ خان علامہ کے بعد ان کی اولاد گوشہ نشین ہو گئی۔ راقم نے اپنے بزرگوں سے سنا تھا کہ خان علامہ آخر عمر میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے گورنر جنرل کے معتوب ہو گئے تھے۔ اس کا قصاص ۱۸۵۷ء میں لیا گیا۔ مواضعات ضبط ہوئے اور اس کے عوض پولیٹکل پنشن دی گئی۔ ابتداء میں یہ رقم کثیر تھی لیکن خاندان کے افراد بڑھتے رہے اور پنشن کی رقم تقسیم ہوتی رہی یہاں تک کہ اب صرف چند لوگوں کے پاس اس پنشن کی اقل قلیل رقم باقی رہ گئی ہے۔ اس طرح انیسویں صدی کی ساتویں دہائی کے ختم ہونے تک بہت سے رؤسا و عمائدین اپنی حیثیت کھو چکے تھے یا کم حیثیت رہ گئے تھے۔ پھر بھی جو باقی رہ گئے تھے وہ لکھنؤ کی آبرو سنبھالے تھے۔

بیسویں صدی کے اوائل میں جن رئیسوں کے دربار لگتے تھے، ان کا مختصر تذکرہ ابواب ماقبل میں ہو چکا ہے۔ یہی لوگ ہمارے معاشرے کے ستون تھے لیکن حالات تیزی کے ساتھ بدل رہے تھے۔ خاندانوں میں افراد کے اضافے ہو رہے تھے اور دولتیں ورثاء میں تقسیم ہو رہی تھیں اور ہر رئیس کی ہر اولاد اپنے آباواجداد کی وضعداریاں چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوتی تھی۔ ظاہر ہے کہ پرانی آن بان اور شان و شوکت برقرار

رکھنا بہت دشوار تھا لہٰذا اب مہاجنوں سے قرض لینے کی نوبت آ گئی۔ اس زمانہ میں دس روپئے سیکڑا ماہواری سود کا عام نرخ تھا اور اسی شرح سود پر ہمارے رؤسا بلا تکلف پرونوٹ لکھ کر رقمیں قرض لے رہے تھے۔ بعض درباروں میں رؤسا کے مختار بھی اتنے نمک فراموش ہو گئے تھے کہ وہ رئیس اور مہاجن دونوں سے منفعت حاصل کرتے تھے۔ قرض لینے والے کچہری اور عدالت کے نام سے بھی ڈرتے تھے۔ کچھ خوف طاری رہتا تو اس سے زیادہ دعویٰ ہو جانے کو اپنے بزرگوں کی عزت پر حرف آنے کے برابر سمجھتے تھے۔ ان کی اس ذہنیت کا ان کے مختار اور مہاجن دونوں فائدہ اٹھاتے تھے اور جلد جلد اصل و سود شامل کر کے پرانے پرونوٹ کی تجدید ہو جاتی تھی۔ راقم کو اپنے ایک محترم اور مخلص دوست کے معاملات کا جائزہ لینے کا اتفاق ہوا تھا۔ انکم برڈا سٹنیس ایکٹ پاس ہونے کے بعد تمام سابقہ حسابات کی جانچ سے یہ پتہ چلا تھا کہ موصوف نے اصل رقم مجموعی طور پر صرف ستر ہزار روپئے کی مختلف اوقات میں قرض لی تھی اور وقتاً فوقتاً ایک لاکھ ۴۳ ہزار روپئے نقد اور جائداد کی شکل میں ادا کر چکے تھے۔ باقی ماندہ رقم پر سود کم کرنے کے بعد بھی عدالت سے تقریباً ۴۵ ہزار کی ڈگری صادر ہوئی تھی یعنی یہ کہ تقریباً پندرہ یا سولہ برس کی مدت میں انہوں نے اصل رقم پر اس کا قریب قریب ڈیوڑھا سود ادا کیا تھا۔ اس سے بدتر حالت اور بہت سے دوسرے گھرانوں کی تھی جہاں پرونوٹ پر لمبی لمبی قرض لی جاتی تھیں اور جائداد غیر منقولہ بھی اس لئے مکفول ہونے لگتی تھی کہ پرونوٹ پر حاصل کردہ رقم روزمرہ کی ضروریات کے لئے ناکافی ہو جاتی تھی اور مہاجن جائداد غیر منقولہ مکفول کرنے کا مطالبہ کرتا تھا۔

فلاکت پوری طرح بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں منڈلانے لگی تھی لیکن غالباً کوئی ایک ایسا رئیس بھی نہیں تھا جس کو آنے والے حالات کا احساس ہوا ہو یا یہ کہ تباہی و بربادی سے بچنے کا کوئی راستہ اختیار کیا ہو۔ یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ وہ لوگ عقل و شعور سے بیگانہ اور فہم و فراست سے بے بہرہ تھے لیکن اپنے رہن سہن، طور طریقوں، وضعداریوں اور دوست داریوں میں اتنی شدت سے والہانہ طور پر گرفتار تھے کہ اپنے کسے مشغلے اور اپنی کسی خواہش و عادت کو ترک نہیں کر سکتے تھے۔ راقم کو اچھی طرح یاد ہے کہ شہر کے مغربی حلقہ میں رہنے والے ایک جلیل القدر رئیس نے بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں اپنے بکرے کا عقد مناکحت اپن ایک دوست کی بکری سے کیا تھا۔ یہ بارات جلوس کے ساتھ متعدد محلوں سے گزرتی ہوئی محلہ وزیر گنج گئی تھی۔ نواب موصوف بہ نفس نفیس بکرے کو دولہا بنا کر تشریف لے گئے تھے اور اسی شان و شوکت سے دلہن کو رخصت کرا کے لائے تھے۔ دلہن کو جہیز میں چاندی کا زیور اور سانی بھوسی کھانے کے لئے قلعی دار اور منقش تانبے کے برتن دئے گئے تھے۔ اسی طرح کبوتر بازی کے مقابلے، بٹیر بازی کی پالیاں اور تمام دوسرے تفریحی مشاغل برقرار تھے۔ اس دور میں رؤسا کی صحبتوں میں صرف خدمت گاروں، ملازموں اور مصاحبوں کی تخفیف ضرور نظر آتی تھی جس کی وجہ صرف یہ تھی کہ ان متعلقین میں جو مرجاتا اس کی جگہ پُر نہیں کی جاتی تھی اور نہ نئے تقررات ہوتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اتنی کفایت شعاری کسی طرح بھی کارآمد نہیں ہو سکتی تھی۔ رؤسا و عمائدین کے درباروں کی یہ بدنصیبی بزرگوں کے وقت سے چلی آ رہی تھی کہ ان سے سب آنے والے مشورے حاصل کرتے تھے لیکن ان کو خود مشورہ دینے والا کوئی نہیں تھا۔ دولت و ثروت کی یہ لعنت تھی کہ لوگ صاحبان مقدرت کو نہ صرف اہل الرائے بلکہ عقل مجسم سمجھتے اور ان کو تملق اور چاپلوسی کر کے یہ باور کرا دیتے تھے کہ ان کی عقل میں کوئی فتور نہیں ہے اور ان کا ہر فعل اور ہر ارشاد عین حکمت اور مستحسن ہے۔ رؤسا و عمائدین کے معمولات بھی ایسے تھے کہ ان کو کسی معاملہ پر سوچنے اور غور کرنے کا وقت بھی نہیں ملتا تھا۔ ان کے ملازمین جن کے ذمہ آمدنی اور خرچ کے حسابات رہا کرتے تھے جب تہی دستی کی شکایت کرتے اور ئیس متردد ہو جاتے تو وہی ملازم فی الفور کسی مہاجن اور قرض کی تجویز پیش کر دیتے تھے۔ وقتی ضرورت پورا کرنے کے لئے ہر تجویز منظور ہو جاتی تھی پھر بھی وہ وقت آ گیا کہ بڑے گھروں میں بھی آمدنی کے وسائل تلاش کرنے کی ضرورت سامنے آ گئی۔

امراء و خوش حال شرفا کے طرز معاشرت میں حصول معاش کے لئے بھی بہت سے دروازے بند تھے۔ انگریزی پڑھنا گناہ تھا، سرکاری ملازمت وسیلۂ جہنم تھی، صنعت و حرفت کی طرف توجہ کرنا شانِ ریاست کے منافی اور آبا و اجداد کے وقار کو خاک میں ملانے کے برابر تھا۔ چنانچہ بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں یہی مسئلہ متعدد درباروں اور مختلف خاندانوں میں زیر بحث رہا

ساقی فاروقی

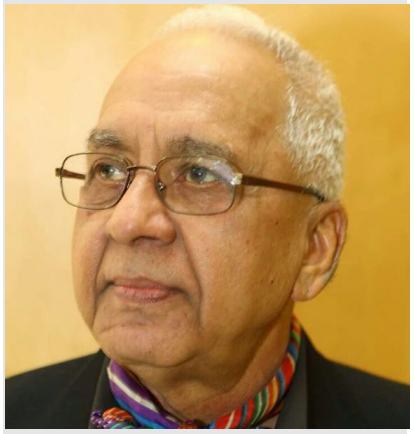

’پاپ بیتی‘ ہو یا ان کی دوسری تخلیقات، ایسا ممکن ہی نہیں تھا کہ ساقی فاروقی کچھ لکھیں اور عالمی پیمانے پر سرخیوں میں نہ آئیں۔ ساقی فاروقی کی ۸۲ ویں سالگرہ کے موقع پر دسمبر ۲۰۱۸ء کا ’نیا دور‘ ساقی فاروقی پر مبنی ہوگا جس میں **اسد محمد خان، زمرد مغل** وغیرہ کے مضامین شامل ہوں گے۔

کرتا تھا۔ بالآخری قرار پایا کہ تجارت کرنا چاہئے۔ شیخ علی عباس مرحوم کے چھوٹے صاحبزادے شیخ محمد عابد مرحوم نے راستہ دکھایا اور جنرل مرچنٹ کی ایک دکان امین آباد میں کھول لی۔ امین آباد کا بازار کچھ ہی برس قبل معرض وجود میں آیا تھا اور جدید کے رجحان نے نیز بڑھتے ہوئے افلاس نے شام کو چوک کی سیر کا ذوق سرد کر دیا تھا۔ شیخ محمد عابد کی دوکان رؤسا و شرفا کی توجہ کر مرکز بن گئی۔ وہ دوکان بہت کامیابی سے چل رہی تھی اور یقیناً روز افزوں ترقی کرتی لیکن عابد مرحوم کی زندگی نے وفا نہ کی۔ ان کے بعد ان کے خاندان میں کاروبار کو سنبھالنے والا کوئی نہ تھا، خود ان یک بچے چھوٹے چھوٹے تھے اس لئے وہ دکان بند ہو گئی۔ اسی دکان کی کامیابی دیکھ کر شیش محل کے نواب رضا حسین خاں مرحوم کے صاحبزادے نواب جعفر حسین مرحوم نے شیش محل اسٹورس کے نام سے ایک بڑی دوکان کھول لی تھی۔ اسی دکان میں نہ صرف ہر ضرورت کا سامان تھا بلکہ زیبائش و آرائش کی بھی اشیاء تھیں اور اس کی سجاوٹ بھی دیدہ زیب اور دلفریب تھی۔ شان ریاست کو برقرار رکھنے کے لئے ملازمین کی بھی بہتات تھی لیکن مالک دکان کو بذات خود توجہ کرنے کا بہت کم موقع ملتا تھا۔ وہ صرف سیر و تفریح کرنے کے انداز میں دکان پر دن میں صبح اور شام کو آجاتے تھے بہت سا مال ان کے دوست اور احباب قرض کے نام پر لے گئے اور غالباً اس سے زیادہ ملازمین نے بیچ کھایا۔ ایک قلیل وقفہ میں دکان کھلی اور لٹ گئی۔ اس دکان کے لٹ جانے سے شیش محل کے جواب کا جو کچھ خسارہ ہونا تھا وہ تو ہو ہی گیا لیکن بڑا نقصان یہ ہوا کہ رؤسا و عمائدین کے خاندان میں نوجوانوں کے ارادے پست ہو گئے۔ اس وقت شیش محل کا دربار شہر میں بہت ممتاز حیثیت کا مالک تھا۔ اگر نواب جعفر حسین کی دوکان برقرار رہی ہوتی اور انہوں نے تجارت میں کامیابی حاصل کی ہوتی تو اور دوسرے خاندانوں میں بھی ان کی تاسی کرتے ہوئے کاروبار کا ذوق ابھرتا لیکن بدقسمتی سے یہ شوق بھی ابھرا اور ختم ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رؤسا کی آمدنیاں برابر گھٹتی رہیں اور اخراجات روز افزوں بڑھتے گئے۔ مقابلتاً ارزانی بھی کم ہونے لگی تھی اور پہلی جنگ عظیم کے بعد گرانی کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔

> 'نہ روم، نہ اتھینس، نہ قسطنطنیہ اور نہ ہی کوئی دوسرا شہر اتنا دلکش اور دلفریب ہوگا جتنا یہ شہر'
>
> ۱۸۵۸ میں لندن کے ٹائمس اخبار کے نامہ نگار ولیم رسیل نے یہ جملہ لکھنؤ کے لئے اپنی ایک رپورٹ میں لکھا تھا۔ سیدھے سادے لفظوں میں یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ نوابین اودھ کا عہد اپنی تمام تر خصوصیات کے ساتھ پورے ہندوستان کے افق پر غالب تھا۔ لکھنؤ شہر کی شان و شوکت کے قصے عالمی سطح پر مشہور ہونے لگے تھے۔ نواب شجاع الدولہ اور آصف الدولہ کے دور کے لکھنؤ کو جتنی مقناطیسیت حاصل ہوئی، اتنی شائد ہی دوسرے کسی شہر کو نصیب ہوئی ہو۔
>
> پھر وہ دور بھی آیا جب شاداب کلیاں بادِ سموم کے جھونکوں سے کمھلانے لگیں اور سارا ماحول تغیر پذیر ہو گیا۔ پرانی قدروں پر نیا مزاج حاوی ہونے لگا تب اس شہر کی ہیئت بدل گئی۔ لکھنؤ اپنے شاندار ماضی سے مستقل نبرد آزما رہتا ہے، دور کوئی بھی ہو، شعراء، ادباء اور فنکاروں کی دلچسپی اب بھی اسی گزشتہ لکھنؤ میں زیادہ نظر آتی ہے۔
>
> **'دامن کو چھوڑتی ہی نہیں لکھنؤ کی خاک'**
>
> اسی کے پیش نظر 'نیا دور' کے ہر شمارے میں 'گزشتہ لکھنؤ' کے عنوان سے ایک نہ ایک ایسی تحریر پیش کی جائے گی جس میں خطۂ اودھ اور بالخصوص لکھنؤ کے ادبی و تہذیبی سماج کی عکاسی نظر آئے۔ مقصد بازیافت ہے۔ اس سلسلہ کی گیارہویں کڑی کے طور پر **مرزا جعفر حسین** کی کتاب **گزشتہ لکھنؤ کی آخری بہار** سے ایک تحریر **'سود و زیاں کی کشمکش میں جاگیرداری نظام نے دم توڑ دیا'** حاضر ہے۔ ہمیں امید ہے کہ یہ سلسلہ پسند کیا جائے گا۔ 'نیا دور' ایسی تمام تحریروں کا خیر مقدم کرے گا جن میں گزشتہ لکھنؤ کی جھلک نظر آئے۔
>
> **(ایڈیٹر)**

بیسویں صدی کی دوسری دہائی ختم ہونے تک ادبار کے بادل منڈلا کر پوری طرح چھا چکے تھے۔ آئندہ دہائی میں پورے سماج کا ڈھانچہ پاش پاش ہو کر آ گرا تھا۔ رؤسا و عمائدین سودی قرض میں لعنت میں بری طرح سے مبتلا ہو چکے تھے۔ پرونوٹ کے مطالبوں کے دعوے ہو کر ڈگریاں صادر ہو چکی تھیں اور یہ ڈگریاں بڑی بڑی رقموں کی تھیں۔ عدالت میں پیروئ مقدمہ سے آبروریزی ہوتی تھی اور سود کم کرنے کا قانون اس وقت تک کوئی نہیں تھا۔ یہ قوانین تب بنے تھے جب تعلقداریاں ختم ہونے لگی تھیں اور مجلس قانون ساز میں بعض تعلقہ داروں کو اپنے مفادات کی حفاظت کرنے کا موقع ملا تھا۔ جب یہ وقت آیا تو لکھنؤ کے قدیم رؤسا و عمائدین کے گھرانے تباہ ہو چکے تھے۔ ان کی تباہی بیحد افسوسناک اور عبرت ناک تھی۔ ایک قلیل مدت میں سارا بھرم خاک میں مل گیا تھا اور کچھ نہ پتہ چلا کہ ان کا سارا جاہ و حشم کہاں چلا گیا۔ اس تباہی کی ابتدا پہلے جائداد منقولہ کی علیٰحدگی سے شروع ہوئی تھی۔ کسی کی بیگم کے گوہر غلطاں کا جوڑ بمبئی جا کر فروخت ہوا تو کسی سرکار کے جواہرات کلکتہ اور دلی روانہ ہو گئے۔ ان کے دام کتنے لگے، کتنی رقم درمیانی شخص کی جیب میں گئی اور کتنا روپیہ مالک کو ملا۔ یہ تمام امور جواب طلب ہیں اور ایک ایسا معمہ ہیں جو کبھی حل نہیں ہوا۔ ساتھ ہی ساتھ شال دوشالے، پشمینے، جامہ واریں اور مہر مائیں بھی بازار میں آنے لگیں۔ لیکن ان کی فروخت اس قلیل رقم پر ہو جاتی تھی جس پر یہ قیمتی ملبوس مہاجنوں کے پاس رہن کئے جاتے تھے۔ قلمی نسخے اور مخطوطات بے رحمی کے ساتھ نخاس کے بازاروں میں پیش ہوتے تھے۔ باہر کے لوگ اور سیاح معقول دام پر دے کر خرید تے لیکن مالک کو وہی رقم مل پاتی جو دکاندار پیش کر دیتا تھا۔ قرین قیاس یہ بھی ہے کہ جائداد منقولہ کا قابل لحاظ حصہ ایسا تھا جس کی قیمت رؤسا و عمائدین کو صرف وعدوں کی شکل میں ملی تھی۔ ان کے اخلاق ان کو اس کی اجازت ہی نہیں دیتے تھے کہ وہ اپنی چیز کے داموں میں مول تول کریں یا باقی رہ جانے پر تقاضا کریں یا نادہندہ خریدار کی دیدہ و دانستہ بددیانتی کی مذمت یا شکایت کریں۔ انہیں حالات کا

تذکرہ آجانے پر ایک مرتبہ تحسین گنج کے ایک رئیس نے راقم سے یہ فرمایا تھا کہ 'ہم پر وقت پڑا ہے، جو ہماری قسمت میں تھا وہ ہو رہا ہے، ہم کو کسی دوسرے سے کوئی شکایت نہیں۔' ان بزرگوں کی داستان بے کسی اس قول کے حرف حرف میں نظر آتی ہے بشرطیکہ چشم بصیرت وعبرت ہو۔

جائداد منقولہ کی علیٰحدگی انتہائی احتیاط اور صیغۂ راز میں کی جاتی تھی لیکن ایسے سودے بازی جس میں عدیم المثال زر وجواہر کی فروختگی کا مرحلہ درپیش ہو خفیہ نہیں رہ سکتی تھی۔ جس رئیس کا مال بازار میں آتا، جوہری بھانپ لیتے اور آپس میں تذکرہ کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ ہر رئیس کا بھرم جاتا رہا اور مہاجنوں نے مکفولی قرضوں کی ادائیگی کے بھی تقاضے شروع کر دئے۔ دوسری طرف ڈگریاں بھی اجرا ہونے لگیں۔ اس ہر طرف کی یلغار نے مقروض شرفا کے دماغی توازن کو بھی مجروح کر دیا تھا۔ وہی لوگ جن کا دیانت داری احترام کرتی تھی اب اپنی جائدادوں کو جتنی بھی بچ سکیں، بچانے کی فکر کرنے لگے۔ جس کا واحد طریقہ ادائی دین مہر کی شکل میں تھا۔ راقم کے ایک محترم دوست، جو خاندان شاہی کے ایک فرد تھے، بہت مغلوب الغضب رئیس تھے، وہ کثیر جائداد کے مالک تھے اور اس وقت بھی ان کے قبض وتصرف میں بے شمار جواہرات تھے لیکن عمائدین کی عام تباہی کی خبریں سن کر ایک مہاجن نے غالباً صرف چار ہزار روپئے کی ڈگری ان کے خلاف اجرا کرائی اور قرقی لے کر ان کے گھر پہنچ گیا۔ ان کو پہلے سے خبر مل چکی تھی۔ انہوں نے کچھ ٹوٹا پھوٹا اور پرانا دھرانا مال واسباب ایک بڑے ہال میں جمع کرا دیا اور اسی کو قرق کر کے عدالت میں مذکوریوں کو آگے نہیں بڑھنے دیا۔ ان کے خلاف تادیبی کارروائی کے لئے درخواست گزری جو عدالت ابتدائی سے منظور ہوئی لیکن اپیل میں وہ کامیاب ہوئے۔ اس دوران انہوں نے اپنی کل جائداد منقولہ وغیر منقولہ کا ہبہ نامہ بالعوض دین مہر اپنی اہلیہ کے حق میں لکھا دیا اور اس دستاویز کے خلاف کارروائی کی مدت ختم ہونے تک لکھنؤ کی سکونت ترک کر دی۔ مختصر یہ کہ اس حکمت عملی سے انہوں نے اپنی بہت سی جائداد غیر منقولہ محفوظ کر لی ورنہ زیادہ تر رؤسا وعمائدین کا یہ حشر ہوا کہ ان کے محل اور محل سراؤں کے اب نام ونشان باقی نہیں رہے اور جو باقی ہیں ان کو دیکھ کر رونا آتا ہے۔ کثرت اولاد، خستہ حالی اور گرانی نے وہ حالت کر دی ہے کہ

'چغد نوبت می زند بر گنبد افراسیاب'

بیسویں صدی کی چوتھی دہائی کے شروع ہونے تک رؤسا وعمائدین کے تمام درباروں کی مسندیں اٹھ چکی تھیں۔ مصاحبین اور ڈیرے دار طوائفوں کے طبقات یک لخت معدوم تھے۔ خواص وعوام میں انگریزی حکومت سے خوف ونفرت کا جذبہ ختم ہو چکا تھا اور اب عوام انگریزی تہذیب کے دلدادہ ہو گئے تھے۔ قدیم لکھنؤ کی معاشرت لٹے پھٹے رؤسا کے ٹوٹے پھوٹے محلوں اور بعض شرفاء کے گھروں میں محدود تھی۔ رفتہ رفتہ یہ لوگ بھی مرکھپ گئے اور اب پرانی تہذیب کی صرف اس وقت یاد آجاتی ہے جب نئے زمانے والے بداخلاقیوں، بدکرداریوں اور بدتہذیبیوں کے مظاہرے کرتے ہیں۔ ماضی کی یاد ہمیشہ اور ہر قوم کے لئے دل خوش کن رہی ہے لیکن لکھنؤ کی قدیم معاشرت کے فنا ہو جانے کا اس لئے ماتم کرنا پڑتا ہے کہ انسانیت شرافت سے محروم نظر آتی ہے یا یوں کہئے کہ اخوت و محبت اور مہر ووفا کی پرانی قدریں جن کو پرانے لوگ عین شرافت سمجھتے تھے ہم سے چھن گئیں اور صرف اس لئے چھن گئیں کہ قدیم تہذیب کے معماروں اور علمبرداروں نے زندگی کا مقصد تعیش اور جذبات پرستی کو قرار دے کر بدلتے ہوئے زمانے سے کوئی سبق نہیں لیا اور اپنے طرزِ قدیم کے جاگیرداری نظام میں کسی اصلاح کے بارے میں میں تصور بھی دماغ میں نہیں آنے دیا اور کثرت عیش پسندی میں خود اس نظام کو بھی فنا کرا دیا۔

❑❑❑

اودھ نمبر کتابی شکل میں

'نیا دور' نے گزشتہ برسوں میں کئی اہم اور دستاویزی نمبر شائع کئے ہیں۔ انہیں میں سے ایک 'اودھ نمبر' بھی ہے جسے دو حصوں شائع کیا گیا تھا۔ اب اسے ایک کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ اردو ادب وتاریخ سے دلچسپی رکھنے والے جو قارئین کرام اسے خریدنا چاہتے ہیں، وہ نیا دور سے براہ راست یا بذریعۂ ای میل رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔ اس کی قیمت ۲۰۰/روپئے ایڈوانس دینی ہوگی اور اسے منگوانے کیلئے ڈاک یا کوریئر پر آنے والا خرچ ۵۰/روپئے ملا کر کل قیمت ۲۵۰/روپئے خریدار کے ذمہ واجب الادا ہوگی۔

ایڈیٹر ماہنامہ 'نیا دور'

بندیا

سپنا مانگلک

ہندی افسانہ نویس اور شاعرہ
افسانوں کی دو کتابیں اور غزل اور نظموں
کے دو مجموعوں کے ساتھ ساتھ ادبیات
اطفال پر تین کتابیں منظر عام پر، آکاش
وانی اور دوردرشن پر متعدد افسانے نشر،
وطن بھرت پور (راجستھان)
ان کی اس ہندی کہانی کا ترجمہ
صدف نے کیا ہے۔

آج پھر اسکول جاتے وقت 'بندیا' دکھائی پڑ گئی۔ نہ جانے کیوں نہ بندیا میرے سامنے جب تک آ ہی جاتی ہے۔ شاید 'لا آف ریورس افیکٹ' انسانوں پر کچھ زیادہ ہی اثر انداز ہوجاتا ہے۔ جس آدمی سے ہم دور رہنا چاہتے ہیں یا جسے محض دیکھنے ہی سے موڈ خراب ہوجاتا ہے وہی اکثر آپ کے سامنے آکر کھڑا ہوجاتا ہے۔

بندیا نے میرے ساتھ کبھی کچھ غلط نہیں کیا بلکہ سامنے آتے ہی ہمیشہ نمستے ماسٹر جی کہہ کر میرا استقبال ہی کرتی ہے پھر بھی اس کی دل چھینک ادا، اس کے ذومعنی جملے اور مردوں کے ساتھ اتنا بیباک رویہ کے سبب محلے میں اس کے کردار پر شک کرتے تھے اور میرا بھی خیال کچھ اس سے الگ نہیں تھا۔

میرے اندر موجود استاد کسی بھی انسان کو اصولوں اور رواجوں کی کسوٹی پر جانچنے پرکھنے پر ہمیشہ ملامت کرتا تھا لیکن دماغ کی پروگرامنگ تو بچپن میں سکھائی گئی تہذیب کے ذریعہ ہی ہوگئی تھی۔ جس طرح کمپیوٹر ایک سیٹ پروگرام کے تحت چلتا ہے اسی طرح انسان کا دماغ بھی ہے۔

انسان زمانۂ قدیم کی ذات، مذہب، کردار وغیرہ کی پروگرامنگ کے تحت ہی سوچتا چلا آرہا ہے کیونکہ ابھی تک نہ اس پروگرامنگ کو کسی نے خارج کیا ہے اور نہ تبدیل کرنے یا اپڈیٹ کرنے کی کوشش کی ہے۔ خیر موضوع پر آتے ہیں۔ بندیا پر نظر پڑتے ہی میرا منھ ایسا بن جاتا تھا جیسے کوئی لقمہ میرے منھ میں ہو اور نہ اسے نگلا جارہا ہو اور نہ ہی اگلا جارہا ہو۔ بندیا کے تئیں میرے اس خیال سے وہ بھی کافی حد تک متعارف تھی۔ تبھی تو میرے سامنے اس کا وہ انداز نہیں ہوتا تھا جو عموماً دوسرے مردوں کے ساتھ ہوتا تھا۔

اس کے تمام طرح کے قصے قرب وجوار کے نوجوانوں میں کافی مشہور تھے اور اسے یہ لوگ چھمیا، بلّو، دروپدی جیسے ناموں سے پکارتے تھے۔ بندیا بھی ان کے طنز کا جواب بھی ذومعنی جملوں ہی سے دیتی تھی۔ کچھ لوگوں پر اس پر رحم بھی آتا تھا کیونکہ بدنصیبی اور بندیا کا چولی دامن کا ساتھ رہا تھا۔ اس کا ہولدار باپ دوسری عورت گھر لے آیا تھا۔ بندی اور اس کی حاملہ ماں کو بے سہارا چھوڑ کر۔

سات سال کی عمر میں بندیا نے تعلیم کو خیر باد کہا اور ماں اور نوزائیدہ بچے کی ذمہ داری ایک مرد کی طرح اپنے کندھوں پر لے لی اور آمدنی کے لئے دوسروں کے گھروں میں کام کاج کا سہارا لیا۔ بندیا نے بھائی کو پڑھایا لکھایا اور وقت آنے پر اس کے بھائی نے اپنی محبوبہ سے شادی بھی کر لی اور اسے اپنی بڑی بہن کے ہاتھ پیلے کا خیال تک نہ آیا جس کے قوی بڑھتی عمر کے ساتھ کمزور ہوتے جارہے تھے۔

گھر کی نئی بہو کو بندیا پھوٹی آنکھ نہیں سہاتی تھی اوپر سے بندیا کے بارے میں محلے میں اڑتی افواہیں۔ بھائی الگ گھر لے کر رہنے لگا۔ پوتی پوتے کی محبت میں ماں بھی بیٹے کے گھر ہی چلی گئی۔ کچھ دن تو بندیا کو کسی نے گھر کے باہر نہیں دیکھا۔ وہ تنہا گھر میں رہ کر سلگتی اور سسکتی رہی۔

ایک روز جب اچانک وہ گھر سے باہر نکلی تو محلے والے اس کا نیا انداز دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے۔ کچھ بزرگ عورتوں کو یہ کہتے ہوئے بھی سنا گیا:

'آم جب پوری طرح سے پکے نہیں اور اسے توڑ لیا جائے تو ٹھیک نہیں، آپ ہی گر جاوے ہے۔'

محلے میں میرا ایک پرانا طالب علم کشن بھی تھا۔ ان دنوں بندیا پر اس کی نظر عنایت تھی۔ میں اسے کئی بار سمجھا چکا تھا کہ صحیح راستہ پر آجائے اور اپنے باپ کے ٹرانسپورٹ کے کام میں ہاتھ بٹائے۔ وہ سر جھکا کے ساری بات تو سنتا لیکن حرکتوں سے باز نہ آتا۔ اس کے باپ میرا بہت احترام کرتے تھے اور ساتھ ساتھ اسے راہ راست پر لانے کی گزارش بھی کرتے تھے۔ میرے کہنے پر کشن تھوڑا بہت ٹرانسپورٹ کا کام دیکھنے لگا تھا۔

ایک دن اسکول سے آنے کے بعد کھانا کھانے ہی بیٹھا تھا کہ کشن آ گیا۔ آتے ہی پیر چھوئے۔ میں نے بیوی سے کشن کے لئے بھی کھانا لانے کو کہا۔ میں نے پوچھا: ٹرانسپورٹ کا کام کیسا چل رہا ہے؟ اب کوئی غلط کام تو نہیں کرتا؟ وغیرہ وغیرہ۔ کشن نے چھوٹے بچے کی طرح گردن ہلا کر مثبت جواب دیا۔ اس کی اس حرکت پر مجھے ہنسی آ گئی۔ مجھے ہنستا دیکھا اسے حوصلہ ملا اور اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ ماسٹر صاحب! آپ سے ایک مدد چاہئے تھی۔ پلیز منع مت کیجئے گا۔

اسے یوں سنجیدہ دیکھ کر تعجب ہوا کیونکہ گزشتہ بیس سالوں میں اس میں کبھی اس طرح کی سنجیدگی نظر نہیں آئی تھی۔ میں چکرا گیا پھر بھی ہنستے ہوئے کہا: کہیں نقصان وغیرہ کر آیا ہے کیا؟ اور اب پتا جی سے بچنے کے لئے میری ضرورت پڑی ہے؟

'نہیں گروجی! بات کچھ اور ہے۔' کشن نے کہا۔

'ارے اب بتائے گا بھی یا یوں ہی پہیلیاں بجھائے گا۔' میں نے کہا۔

'میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔ اپنا گھر بسانا چاہتا ہوں۔' کشن بولا۔

میں چونک گیا۔ کیونکہ کتنے سالوں سے میں اور کشن کے پتا اسے شادی کے لئے کہتے رہتے تھے لیکن وہ مذاق میں کہتا:

'پہلے کے راجہ مہاراجاؤں کے مزے تھے۔ جتنی چاہو، اتنی رانیاں رکھ لو۔ اب قانون نے ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑا۔'

کشن کے باپو اداس ہو کر کہتے: گروجی! ہمیں تو لگ رہا ہے کہ بغیر پوتے پوتیوں کے اس دنیا سے جانا ہوگا۔

میں نے کہا: ارے یہ تو خوشی کی بات ہے۔ میں تو ابھی تمہارے پتا جی کو فون کرتا ہوں۔

'خوش نہیں ہوں گے۔ دو جوتے لگائیں گے مجھے۔'

'دیکھ! تو کچھ چھپا رہا ہے۔ صاف صاف بتا، بات کیا ہے؟'

'گروجی! میں نے لڑکی پسند کر لی ہے۔ آپ بھی اسے جانتے ہیں۔ بندیا۔' کشن نے بتایا۔

نام سنتے ہی میں غصے سے ہل گیا۔ غصے میں سانپ کی طرح زہر اگلتے ہوئے بولا، کوئی اور ستی ساوتری نہیں ملی ہے تجھے۔ کون سی لڑکی تلاش کی ہے تو نے اپنے لئے، کیا بتاؤں گا تیرے باپ کو؟

'گروجی آپ تو جانتے ہیں جیسی وہ ہے ویسا ہی تو میں بھی ہوں۔'

کشن کے منھ سے یہ جملے سن کر میں لاجواب ہو گیا۔

میں ایک ٹیچر ہو کر رحم دلی کا جو درس اپنے طالب علموں کو نہ دے سکا تھا وہی انمول گیان میرے راہ راست سے بھٹکے ہوئے اس طالب نے مجھے دیا۔ اب میں نے کشن سے وعدہ کیا کہ میں اس کی شادی بندیا سے کرا کر کے ہی دم لوں گا۔

میں نے کشن کے بتا جی سے بات کرنے کے لئے دل ہی دل میں پلاٹ تیار کیا اور فوراً ان کے آفس پہنچ گیا۔

انہیں اس شادی کے لئے منانے کے لئے مجھے کافی پاپڑ بیلنے پڑے اور اس کے پتا جی کو اپنی گارنٹی بھی دینا پڑی کہ بندیا شادی کے بعد اچھی بہو کی طرح بہتر رویہ اپنائے گی اور کشن بھی اپنے برے کام چھوڑ کر کام پر توجہ دے گا۔

کہتے ہیں نا! انت بھلا تو سب بھلا۔

کشن اور بندیا آج تین بچوں کے ماتا پتا ہیں۔ اب بندیا میں مجھے ایک بہتر بیوی اور ماں دکھائی دیتی ہے۔

ہم غلط کو غلط ثابت کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتے ہیں مگر غلط کی اصلاح کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ نہ جانے کب ہم اپنے دماغ کی پروگرامنگ اپڈیٹ کریں گے۔ لیکن جب بھی ایسا ہوگا۔ حقیقتاً سارے مسائل اسی وقت حل ہو جائیں گے۔

❑❑❑

ڈانسر

پیٹریشیا ہائی اسمتھ

امریکی ناول نگار اور افسانہ نویس
ریڈیو، ٹی وی اور فلمی دنیا کا مقبول نام،
سترہ ناولوں کی اشاعت کے ساتھ
ساتھ نو افسانوی مجموعے بھی منظر عام پر

پیدائش: ۱۹ر جنوری ۱۹۲۱ء
وفات: ۴ر فروری ۱۹۹۵ء

ان کی اس کہانی کا ترجمہ
فائزہ تقوی نے کیا ہے۔

جب وہ ایک ساتھ مل کر ڈانس فلور پر اترتے، لاجواب ڈانس کرتے۔ فرش کی سمت یکے بعد دیگرے سے خم ہوتے اور پھر ایک دوسرے سے قدرے فاصلہ بڑھاتے ہوئے تال اور لے پر تھرکنے لگتے۔ کلاندتے بیس سال کی اور روڈولف بائیس کا۔ ساتھ ساتھ ڈانس کرتے کرتے ایک دوسرے کو چاہنے لگے تھے۔ وہ دونوں شادی کرنا چاہتے تھے لیکن ان کے مالک کو یوں محسوس ہوتا تھا کہ محبت کی آنچ میں تپ رہے یہ دونوں اداکار شادی سے محروم ہیں شاید اسی لئے وہ ناظرین کو زیادہ جذباتی کر دیتے تھے۔ لہٰذا وہ دونوں چاہ کر بھی شادی نہیں کر سکتے تھے۔

جس نائٹ کلب میں وہ ڈانس کرتے تھے اس کا نام تھا 'دی ریندیؤ' اور یہ کلب تھکے ہارے اور ادھیڑ عمر کے لوگوں کے درمیان کافی مقبول تھا۔ آپ تشریف لائیے اور کلاندتے اور روڈولف کا دھڑکنیں بڑھا دینے والا ڈانس دیکھئے۔ اس کے بعد بھی آپ کی رگوں میں حرکت نہ ہو، ہو ہی نہیں سکتا۔ اپنے کالم کو مسالے دار بنانے کے لئے رپورٹر ان کے ڈانس کو مختلف اصطلاحات سے نوازتے۔ کیونکہ ڈانس کے دوران اکثر روڈولف کلاندتے کا گلا اس طرح سے دباتا جس سے دیکھنے والوں کو احساس ہوتا کہ اس بیچاری کی جان لبوں پر آ گئی۔ وہ اس کی گردن کس کر پکڑتا اور کلاندتے کو الٹا کر کے نیچے جھکا دیتا۔ اس کے بعد وہ پلٹ بھی جائے تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اپنی مضبوط ہتھیلیوں کو اس کی گردن میں بری طرح پیوست کر کے وہ اتنی تیزی سے دباتا تھا کہ اس کی زلفیں ادھر ادھر پاگلوں کی طرح بل کھانے لگتیں۔

تماش بین کی سانسیں بے صبری میں اکھڑنے لگتیں، چیخیں اور سسکیوں کی آوازیں بلند ہونے لگتیں اور سب لوگ نتیجہ معلوم کرنے کے لئے آنکھیں پھاڑ کر دم سادھے کرسیوں میں چپک جاتے۔ ڈرم بجانے والے تینوں لوگ رفتار اور آواز بڑھاتے جاتے۔ کسی جنون کی طرح۔

کلاندتے نے کافی وقت پہلے ہی روڈولف کے ساتھ تعلقات ختم کر لئے تھے۔ اس کو بھروسہ تھا کہ اس کے جسم سے دور رہ کر روڈولف کی آنچ اور بڑھے گی۔ ڈانس کرتے ہوئے روڈولف کو بیحد جذباتی کرنا ہے، آخری حد تک لے جا کر اس کو پیاسا تڑپتا چھوڑ کر خاموشی سے کیسے اس کے چنگل سے نکل کر دور چلے جانا ہے وہ بھی تالیوں کی گڑگڑاہٹ اور قہقہوں کے سیلاب کے درمیان، کلاندتے کو اچھی طرح معلوم تھا۔

تماش بینوں میں شاید ہی کسی کو یہ احساس ہو کہ کلاندتے حقیقت میں روڈولف کو بھوکا پیاسا چھوڑ کر نائٹ کلب سے باہر نکل گئی ہے۔

کلاندتے اصل زندگی میں آزاد خیال لڑکی تھی۔ زندگی کو اصولوں کا پابند بنا کے رکھنا اس کی فطرت کے خلاف تھا۔ اس کے تعلقات چارلس نام کے ایک امیر اور نرم دل انسان سے تھے۔ کلاندتے اور روڈولف جب پورے جوش وخروش سے ڈانس میں مشغول ہوتے تو ہال میں زور زور سے چیخنے والا چارلس ہی ہوتا۔

وہ اس طرح سب کے بیچ قہقہے لگا کر وہاں ہنس سکتا تھا، کیونکہ اسے معلوم تھا کہ کچھ ہی وقفہ کے بعد کلاندتے اسی کے نزدیک ہوگی۔

ڈانس سے جو بھی آمدنی ہوتی اس میں کلاندتے اور روڈولف کا مساوی حصہ ہوتا اس لئے روڈولف نے کلاندتے پر چارلس سے الگ ہونے کے لئے مجبور کرنا شروع کر دیا۔ چارلس کو نہ چھوڑنے کی صورت میں ڈانس چھوڑنے کی تک کی دھمکی دے ڈالی۔

کافی خوشامد کے بعد اس نے اتنی رعایت کی کہ وہ ڈانس بھلے ہی کرتا رہے گا لیکن وہ کلاندتے ہی گردن پر ہاتھ رکھ کر اس کو مار ڈالنے کا جذباتی دکھاوا بالکل نہیں کرے گا لیکن تماش بین اسی جنونی لمحے کے دیوانے تھے، یہ روڈولف کو اچھی طرح معلوم تھا۔

روڈولف کے اڑیل رویئے کو دیکھ کر کلاندتے چارلس کے ساتھ تعلقات ختم کرنے پر راضی ہوگئی اور اس نے اپنا وعدہ ایمانداری سے نبھایا بھی۔ وہیں کلاندتے کی بے رخی سے مایوس ہوکر چارلس نے بھی کلب کا راستہ چلنا چھوڑ دیا۔

دھیرے دھیرے روڈولف کے سامنے یہ راز بھی افشاء ہوا کہ چارلس کو چھوڑنے کے بعد کلاندتے نے تین دوسرے لوگوں سے تعلقات قائم کر لئے۔ ظاہر ہے کہ اکیلے چارلس کی جگہ جب دوسرے تین دیوانوں نے لے لی تو آمدنی میں بھی اضافہ ہونا ہی تھا۔

اب روڈولف ان تینوں عاشقوں سے بھی رابطہ ختم کرنے کے لئے دباؤ بنانے لگا۔ اس نے حامی تو بھر لی لیکن ہر شام کلاندتے کی قیام گاہ کے سامنے گلدستہ اور نوٹوں کی گڈی لے کر کھڑے ہونے والوں کی قطار طویل سے طویل تر ہوتی جارہی تھی۔

روڈولف اور کلاندتے کے باہمی ارتباط کو پانچ مہینے ہورہے تھے حالانکہ کوئی شام ایسی نہ تھی جب دوسو تماش بینوں کی للچائی نظروں کے بیچ وہ دونوں ڈانس کے دوران ایک دوسرے سے انتہائی قریب نہ ہوتے ہوں۔ ایک ایسی ہی شام تھی جب روڈولف نے کلاندتے کے ساتھ ڈانس کے دوران کلاندتے کی گردن پکڑ کر جیسے ہی اس نے اس کو نیچے جھکایا۔ لوگوں نے جنون میں چلانا شروع کیا اور ....اور ....لوگوں کے اکساوے پر روڈولف کی انگلیاں کلاندتے کی گردن کے چاروں جانب کستی چلی گئیں....اور .... اور....

کلاندتے ڈانس میں روڈولف کے ہاتھوں ہونے والی اس اذیت کو اس کی دلی محبت کی نشانی ماننے کی ریاکاری کرتی رہی تھی۔ اس شام جب ڈانس کے کلائیمکس میں روڈولف کی انگلیوں نے کلاندتے کی گردن کو آزاد کیا اس وقت وہ اٹھی نہیں۔ روڈولف نے بھی اس کو اٹھانے کا کوئی جتن نہیں کیا۔ وہ بار وہ آخر میں ایسا ضرور کرتا تھا۔ اس شام اس نے حقیقتاً کلاندتے کی گردن دبا دی تھی۔ اس کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ کلاندتے کی آواز بھی نہ نکل سکی۔ ڈانسنگ اسٹیج سے روڈولف آرام سے نیچے اترا اور ہال سے باہر نکل گیا۔ فرش پر بے جان کلاندتے ہوئے وہاں سے اٹھایا بھی ان لوگوں نے جن سے شاید ہی وہ کبھی ملی ہو۔

❑❑❑

'نیا دور' کو ایسی ادبی تخلیقات کا شدت سے انتظار ہے جو نہ صرف دلچسپ بلکہ معلوماتی بھی ہوں۔ ایسی تخلیقات جو اعلیٰ درجے کے ادبی شہ پاروں کی حیثیت رکھتی ہیں مگر عام قاری کی دلچسپی سے عاری ہوں تو اسے 'نیا دور' اپنی اشاعتی ترجیحات میں شامل کرنے سے گریز کرے گا کیونکہ معاملہ دراصل اردو کے فروغ کا ہے۔ اردو محض یونیورسٹیوں کے شعبوں، تحقیقی اداروں اور دیگر اردو مراکز تک اپنی مخصوص ضرورتوں کے تحت محدود رہے، اس روش سے بہرحال پرہیز کرنا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ ہم سب کا اولین فریضہ ہے کہ اردو زبان کے فروغ میں پوری تندہی کے ساتھ شامل رہیں اور عام قاری سے اردو کے مراسم کو استوار کرنے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ تخلیق کا غیر مطبوعہ ہونا لازمی شرط ہے۔ تخلیق کے ساتھ اپنی تصویر، ٹکٹ لگا ہوا لفافہ معہ پتہ اور بینک اکاؤنٹ نمبر، آئی۔ایف۔ایس۔سی، برانچ کوڈ والا Cancelled Cheque بھی ضرور ارسال کریں۔ **بغیر بینک تفصیلات کے حاصل ہونے والی تخلیقات کسی بھی صورت میں شائع نہیں کی جائیں گی کیونکہ اس کے سبب ہی دیگر تخلیق کاروں کے اعزازیہ میں غیر ضروری تاخیر ہوتی ہے۔ بغیر بینک تفصیلات کے تخلیقات ارسال کرنے والے اعزازیہ کے حقدار نہیں ہوں گے۔**

جونک

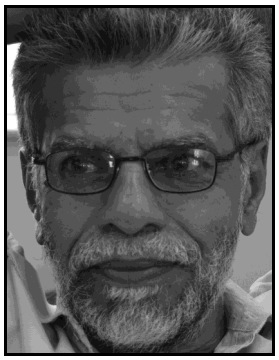

ادیب اختر

کنڑ زبان میں افسانوں کے چار مجموعے شائع، 'تم کہاں ہو' کنڑ ٹی وی سیریئل ۱۰۰ قسطوں کی اسکرپٹ رائٹنگ، مختلف جرائد میں ہندی اور کنڑ زبانوں کے افسانوں کی اشاعت، ۱۰ مرتبہ کہانی مقابلوں میں انعامات سے نوازے گئے

وطن میسور

بنور، ۵۷۱۱۰۱، کرناٹک

رابطہ: 9845371383

جبکہ گھر کے سبھی افراد سوئے ہوئے تھے۔ وشوا منھ اندھیرے اٹھ کر اپنے بستر کے قریب رکھی بیساکھی کے سہارے لنگڑاتے ہوئے دروازے کے پاس پہنچتا تھا۔ کوئی آواز پیدا نہ ہو اس لئے آہستہ سے کنڈی کھول کر گلی میں چلا آتا تھا۔ دھیمے دھیمے قدموں سے قریب کی ہوٹل پہنچ کر چائے پینے کے بعد وہاں بیٹھے لوگوں کے درمیان کچھ دیر بتا کر گھر لوٹتا تھا۔ منھ ہاتھ دھو کر سب کو جگا کر بائیں پاؤں کو عارضی پاؤں سے جوڑنے کے بعد وہ دوبارہ گھر سے باہر آتا تھا۔ آٹو پکڑ کر وہاں سے چھ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع اشوکہ سرکل پہنچتا تھا۔ دو بھائیوں، بھابھیوں اور ان کے بچوں کے ہمراہ وشوا ایک پرانے گھر میں زندگی گزار رہا تھا۔ مٹی کی دیواروں، دیسی کھپریل کا یہ گھر اُن کے بزرگوں کا تھا جو ان کو ورثہ میں ملا تھا۔

یہیں قریب ہی ان کی بہن سکنیا کرائے کے مکان میں اپنے اکلوتے لڑکے کے ہمراہ رہتی تھی۔ وہ بیوہ تھی۔ اس کا لڑکا دسویں جماعت میں تعلیم پا رہا تھا۔ بڑا بھائی شیونا، مارکٹ کے باہر فٹ پاتھ پر کیلے بیچتا تھا۔ دوسرا بھائی سوموٹھیلے میں ترکاری بیوپار کرتا تھا۔ سکنیا گارمینٹ کو جاتی تھی۔ حالانکہ وہ سب جینے کے لئے الگ الگ راستوں پر تھے۔ اس کے باوجود وہ سبھی وشوا کی آمدنی پر نظریں جمائے ہوئے تھے۔ اشوکہ سرکل کے قریب دو سنیما گھر تھے۔ بس اسٹینڈ آدھے کلومیٹر سے بھی کم فاصلے پر تھا۔ سرکل کے پاس ہی ایک ہوٹل تھا۔ کل ملا کر وہاں صبح سے شام تک لوگوں کی بھیڑ ہوتی تھی۔ سرکل میں اپنا عارضی پاؤں کھول کر رکھنے کے بعد اسکے سامنے بیٹھ کر وشوا راہگیروں کے آگے ہاتھ پھیلا کر بھیک مانگتا تھا۔ وہاں اسے ہر قسم کی سہولت میسر تھی۔ چائے بیچنے والے لڑکے وہاں آتے تھے، ان سے وہ چائے خرید کر پیتا تھا۔ سرکل ہی میں پبلک شوچالیہ تھا۔ چائے والے لڑکوں سے وہ ہوٹل سے کھانے کی چیزیں منگوا لیتا تھا۔ سرکل میں صبح شام دکھائی دینے والوں سے اس نے جان پہچان پیدا کر لی تھی۔ وہ سب کے ساتھ گھل مل گیا تھا اور کبھی کبھی اپنی پریشانی بھی انہیں سناتا تھا۔ کسی کسی دن گھر میں سب کے ساتھ مل جل کر آرام سے رہنے کو اس کا جی چاہتا تھا مگر اس کے گھر والے اس کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ نئے کپڑے سلوانے کو کہتا تو سلوانے کا وعدہ کرتے مگر سلواتے نہیں تھے۔ صبح سے شام تک اس کی جتنی بھی آمدنی ہوتی تھی وہ اسے لے جا کر شیونا کے حوالے کرتا تھا۔ اس کے گھر لوٹتے ہی سکنیا چپکے سے چلی آتی تھی۔ وشوا کی آمدنی تینوں بھائی بہن آپس میں تقسیم کر لیتے تھے۔

کبھی کبھی سکنیا کا لڑکا اپنی ضرورت آن پڑنے پر اشوکہ سرکل آجاتا تھا اور وشوا سے کچھ نہ کچھ مانگتا تھا۔

شام ڈھلے وشوا گھر لوٹتا تھا تو ان کے گھر میں خوشیوں کا ماحول ہوجاتا تھا اور بھائی کے بچے اس سے لپٹ جاتے تھے۔ وہ گھر لوٹتے وقت بچوں کے لئے مٹھائی لے کر آتا تھا۔ وشوا کی عمر اب تقریباً تیس کے آس پاس تھی، وہ پیدائشی اپاہج نہیں تھا۔ ہوش سنبھالنے سے پہلے والدین کا انتقال ہوگیا تھا۔ بہن اور بھائی نے اس کی پرورش کی تھی اسی لئے وہ انہیں کو اپنے ماتا پتا سمجھتا تھا۔ جوان ہونے کے بعد وہ پرائیویٹ بس اسٹینڈ پر قلی کا کام کرتا تھا۔ ایک بار وہ بس کی چھت پر سامان ڈال رہا تھا۔ اس سے بے خبر ڈرائیور نے بس آگے بڑھادی تھی۔ وشوا اوپر سے گر پڑا اور پچھلے پہیے میں اس کا پیر چلا گیا تھا۔ یہ تین برس پہلے کی بات تھی۔ بس کے مالک نے وشوا کو نرسنگ ہوم میں داخل کروایا تھا۔ وہاں کا سارا خرچ اُس نے اپنے ذمہ لیا تھا۔ وشوا کو نرسنگ ہوم سے ڈسچارج کراتے وقت اس نے وشوا کے گھر والوں کے حوالے چالیس ہزار روپیے کئے تھے۔ بس کے مالک نے جو روپیے دئے تھے اُن سے شیونا نے گھر کی مرمت کروائی تھی اور کچھ رقم سکنیا کو بھی دی تھی۔ اسپتال سے ڈسچارج ہونے کے بعد وشوا گھر پر ہی رہا۔ اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی تھی کہ وہ آگے کیا کرے۔ کسی بھی وجہ سے وہ گھر والوں کے لئے بوجھ بننا نہیں چاہتا تھا۔ آخر ایک دن اُس نے اشوکہ سرکل کا رخ کیا۔

اِدھر کچھ دنوں سے اس کے دھیان میں یہ بات بھی آئی تھی کہ اس کے گھر والے یہ چاہتے ہیں کہ وہ ان کے کہنے کے مطابق چلے۔ اگر انہیں اس کے مستقبل کی رتی بھر بھی فکر ہوتی تو وہ اس کا بیاہ رچاتے۔ اپاہج کو لڑکی دینے پر کوئی بھی آمادہ نہیں ہوگا، کا بہانہ نہ کرتے۔ اندھے کو بھی بیاہ رچا کر آرام کی زندگی گزارتے ہوئے اس نے دیکھا تھا گھر والوں کے رویئے سے عاجز آکر کہیں دور بھاگ جانے کا ارادہ بھی اس نے کئی بار کیا تھا مگر وہ ان لوگوں کو مایوس نہیں کرنا چاہتا تھا جو اس کی آمدنی پر آس لگائے ہوئے تھے اس لئے وہ سب کچھ برداشت کرلیتا تھا۔ اسے اس بات کا پورا بھروسہ تھا کہ جب تک اس کے جسم میں ایک ایک قطرہ خون ہے، وہ لوگ اسے چوسے بغیر نہیں چھوڑیں گے۔ چونکہ وہ میرے اپنے ہی ہیں۔ اس لئے ان کو میرا خون چوسنے کا حق ہے۔ یہی سوچ کر وہ خاموشی اختیار کرلیتا تھا۔ رات کے آٹھ بجنے سے پہلے وشوا گھر لوٹ آتا تھا۔ اس وقت گھر کے سبھی افراد اس کا بے چینی سے انتظار کرتے تھے گھر کے سامنے آٹو کے رکتے ہی بچے دوڑتے ہوئے جاکر وشوا کو آٹو سے اترنے میں مدد کرتے تھے۔ عام طور پر وشوا صبح کا ناشتہ، دوپہر کا کھانا باہر ہی کھاتا تھا مگر رات کا کھانا تو وہ سب کے ساتھ مل کر ہنسی خوشی کھاتا تھا۔ اس رات آٹھ بجنے کے بعد بھی وشوا گھر نہیں لوٹا تو گھر والوں کو پریشانی نے آگھیرا۔ ہم سے تنگ آکر وہ کہیں چلا تو نہیں گیا۔ دلوں میں اٹھنے والے ان اندیشوں کے باوجود بھی وہ وشوا کا انتظار کرنے لگے۔ وشوا گھر نہیں آیا۔ اچانک اشوکہ سرکل سے یہ خبر آئی کہ وہاں شام ساڑھے سات بجے بم پھٹ پڑا ہے۔ اس خبر کو سنتے ہی شیونا اور سوموا اپنی اپنی سائیکلوں پر سوار ہوکر اشوکہ سرکل کی جانب روانہ ہوگئے۔ اشوکہ سرکل میں بم پھٹ پڑنے کے بعد سے بجلی نہیں تھی جس کی وجہ سے سارا علاقہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ سارے علاقے کو پولیس نے گھیر رکھا تھا۔ اندر جانے کو کسی کو بھی اجازت نہ تھی۔ وہاں ہر شئے پرزے پرزے ہوکر بکھر گئی تھی۔ انسانوں کے جسموں کا بھی یہی حال تھا۔ اس حادثے میں کم از کم بیس افراد کے مارے جانے کا اور سو سے بھی زیادہ افراد کے زخمی ہونے کا امکان تھا۔ زخمیوں کو اسپتالوں میں پہنچا دیا گیا۔ ایسے میں پورے یقین کے ساتھ کوئی بھی کہہ نہیں سکتا تھا کہ وشوا ابھی زندہ ہے یا نہیں۔ زخمیوں کو کن کن اسپتالوں میں پہنچایا گیا ہے، یہ معلومات حاصل کرنے کے بعد شیونا، سومو، سکنیا اور اس کا لڑکا ایک ایک طرف بھاگے، اسپتالوں میں وشوا کو ڈھونڈا مگر اس کا کسی بھی اسپتال میں پتہ نہ چلا۔ ایک ایک کرکے سبھی گھر پہنچے۔ اگر وشوا بچ گیا ہوتا تو اس وقت تک اسے گھر پہنچ جانا چاہئے تھا۔ یہ سبھی نے سوچا۔ چاہے کچھ بھی ہو، صبح کو اشوکہ سرکل میں پہنچ کر لاشوں میں اسے ڈھونڈھنا چاہئے۔ آخر میں سبھی اسی نتیجے پر پہنچے۔

رات کے دس بجے کے قریب ریاست کے وزیر اعلیٰ نے بم پھٹنے پر مارے جانے والوں کے گھر والوں کو سات لاکھ کی مالی امداد دینے کا اعلان کیا۔ ٹی وی پر اس اعلان کو سن کر سبھی کی نیند دور ہوگئی۔ اس وقت تک وہ سبھی یہی چاہتے تھے کہ وشوا زندہ بچ جائے مگر اب یکا یک ان کے سوچنے کا نظریہ بدل گیا۔ اگر وشوا کی لاش نہ ملی تو کوئی لاوارث لاش کو ہی وشوا کی لاش ثابت کرنے کے بارے میں وہ سبھی سوچنے لگے۔ صبح سبھی اشوکہ سرکل جانے کی تیاری کررہے تھے کہ گھر کے سامنے ایک آٹو رکا۔ سب کی نظریں اس طرف تھیں۔ آٹو سے وشوا اتر رہا تھا۔ جہاں بم پھٹا تھا، وہاں وشوا کے گھر والے موجود نہیں تھے۔ اس لئے ان کو بم پھٹنے کا کوئی تجربہ نہیں تھا مگر اس وقت اپنے سامنے وشوا کو زندہ دیکھ کر انہوں نے یوں محسوس کیا جیسے ان کے اندر بم پھٹ گیا ہو۔ وہ سب لرز گئے۔

بچے خوشیوں کے ساتھ آٹو کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔ ان کے پیچھے بھاری بھاری قدموں سے بڑے لوگ اس کی جانب روانہ ہوئے۔ وشوا، پہلے جس بس اسٹینڈ پر قلی تھا اس کے ساتھ قلی کرنے والوں میں بلی گری بھی تھا۔ کل شام اشوکہ سرکل میں بلی گری کی وشوا سے اچانک ملاقات ہونے پر وہ اسے اپنے گھر لے گیا تھا۔ وشوا کے سرکل سے روانہ ہونے کے بعد ہی بم پھٹا تھا۔ بم پھٹنے کے بعد آٹو نہ ملنے کے سبب وشوا بلی گری کے یہاں رک گیا تھا۔ وشوا کی جان بچ گئی۔ یہی بھگوان کی کرپا ہے۔ بلی گری نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا مگر وشوا کے گھر والے مسکراتے چہروں سے وشوا کا استقبال کرنا ہی بھول گئے۔

❑❑❑

ٹوپی

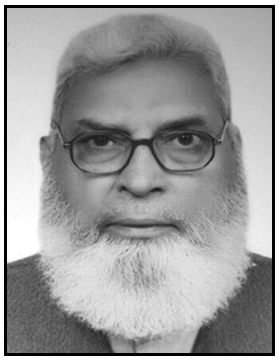

حبیب الرحمن چغانی

مصنف ومترجم

۳؍کتابیں منظرعام پر، سابق ڈائرکٹر خدابخش اورینٹل لائبریری، پٹنہ، سابق ڈپٹی لائبریرین، مولانا آزاد لائبریری، اے ایم یو، علی گڑھ

وطن گنور (سنبھل)

حریم ملت روڈ، دودھ پور، سول لائن، علی گڑھ

رابطہ: 9997176114

آبادی ہے کہ کلاہِ باراں کی طرح بڑھتی ہی جارہی ہے اوران سروں کی فصلیں بھی تیزی سے اگ رہی ہیں جن کی زینت ٹوپی بن سکتی ہے۔ یوں تو ہر روز طرح طرح کی ٹوپیاں دیکھنے کو ملتی ہیں مگر ایک ٹوپی ایسی ہے میں جب بھی اسے دیکھتا ہوں، ایک جھٹکا سا لگتا ہے۔ وہ کوئی نرالی ٹوپی نہیں ہے۔ ایک معمولی سی دو پلی ٹوپی ہے۔ جب بھی مسجد جاتا ہوں، یہ ٹوپی میری آنکھوں میں کھٹکتی ہے۔ میلی کچیلی، گندی اور ادھڑی ہوئی یہ ٹوپی! دیکھ کر کراہت کا احساس ہوتا ہے۔ حیرت ہے اس ٹوپی والے کو نہ اس کی گھر والی کو ہی خیال آتا ہے کہ اس کی مرمت کر کے دھوڈالے۔ دنیا سے بے نیاز وہ اسی حال میں مست ہیں۔ انہیں ٹوپی بے نہ خیالِ اغیار۔ میں نے سوچا کہ میں خود ہی یہ کام کیوں نہ کر ڈالوں! چھٹی حس نے مجھے روک دیا۔ سمت مولا آدمی ہیں، کہیں مجھ پر ہی سیدھے ہو گئے تو؟ وہ کہہ سکتے ہیں ٹوپی میری ہے یا آپ کی، وہ گندی ہے یا پھٹی، میں نہیں سلواتا۔ آپ کون ہوتے ہیں؟ بہتر ہوگا اپنی ٹوپی پر نظر رکھیں اور دوسروں کی ٹوپیوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیں۔ آپ کیا خدائی فوجدار ہیں؟ اف توبہ! یہ تو بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ دینا ہوگا۔ یوں تو سوال کا پٹارا کھل جائے گا۔ واقعی اس زمانے میں اپنی ٹوپی سنبھالنا مشکل ہے اور ہم چلے ہیں دوسروں کی ٹوپیوں کا خیال رکھنے! بات تو ٹوپی والے کی بالکل صحیح ہے کہ اپنی ٹوپی کی فکر کرو۔ کیا معلوم کب کس کی ٹوپی اتر جائے! مگر تھوڑے تھوڑے وقفے سے ایک کیڑا دماغ میں کلبلاتا رہا۔ اگر معقول انداز میں نرم گوئی سے درخواست کی جائے تو وہ اس پر غور کر سکتے ہیں۔ آدمی بہرحال معقول معلوم ہوتے ہیں۔ یہی تجربہ کیا جائے۔ معاً خیال آیا اگر عین وقت پر زبان لڑکھڑا گئی تو سارا معاملہ چوپٹ ہو جائے گا لہٰذا بہتر ہے پہلے رہرسل کرلیا جائے۔

'اگر اجازت ہو تو ایک بات عرض کروں'

بہت قاعدے سے جواب دیا: 'فرمائیے۔'

'کیا آپ اپنی ٹوپی کچھ وقت کے لئے مجھے عنایت کر سکتے ہیں؟'

'میں دوسری نماز میں واپس کردوں گا' سوچا خود ہی سلائی کر کے اور دھو کر کے دے دوں گا۔

شاید لجاجت سے کی گئی میری اس درخواست کو وہ قبول کر لیں مگر بروقت میری فکر نے مجھے آگاہ

کر دیا۔ وہ مجھے دیکھ کر کہہ سکتے ہیں:

'بظاہر تو آدمی معقول لگتے ہیں۔ ٹوپی سر پر لگی ہوئی ہے پھر بھی میری ٹوپی مانگ رہے ہیں! میں اپنی ٹوپی کیوں دے دوں جناب! اتنی ٹوپیوں میں میری ہی ٹوپی آپ کو پسند آئی! ایسا ہی ٹوپیوں کا شوق ہے تو مسجد کے دروازے پر بہت دکانیں ہیں جتنی ٹوپیاں چاہیں خرید لیں۔ معاف کیجئے! کیا آپ کو ٹوپیوں کا خبط ہے؟'

خدا کی پناہ! یہ سب کچھ سننا پڑے گا۔ بلا وجہ میں خود کو اس بکھیڑے میں ڈالنا چاہتا ہوں۔ یہ تو 'آ بیل مجھے مار' والی بات کی ہوگی۔ واقعی ٹوپی انکی ہے۔ وہ گندی پہنیں یا صاف! وہ جانیں ان کا کام جانے۔ مجھ سے کیا واسطہ! قاضی جی شہر کے اندیشے میں دبلے!! یہ تو ایک قسم کا مذاق ہو گیا۔ کسی کا دامن پھٹا ہوا تو کسی کا گریباں چاک، کسی کا پائجامہ ادھڑا ہوا تو کسی کی لنگی کے داغ۔ میں کس کس کی خبر رکھوں گا۔ جو خود سے بے خبر ہوں ان کی خبر کون رکھے! سمجھ دار لوگ کسی کے پھٹے میں پاؤں نہیں دیتے۔ کسی کے معاملے میں ٹانگ اڑانا مصیبت مول لینا ہے مگر یہ تو بے حسی ہوگی! اگر انسان کو انسان سے ہمدردی نہ ہو تو معاشرہ بکھر جائے گا۔ یہ انسانی تعلق ہی تو ہے جو سوسائٹی کو قائم رکھتا ہے۔ اگر چھوٹی موٹی باتوں کا بھی خیال نہ رکھا جائے تو بڑے معاملات میں کسی سے کیا امید کی جاسکتی ہے۔ پھر تو یہی کہنا ہوگا:

جب توقع ہی اٹھ گئی غالبؔ
کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

یہ بھی ایک عجیب مشاہدہ ہے کہ جہاں تعلیم کی زیادتی اور دولت کی فراوانی ہوتی ہے۔ وہاں عام آدمی سے رشتہ ٹوٹنے لگتا ہے۔ وہ لوگ خود ہی میں مست رہتے ہیں۔ ان کی دنیا الگ ہی ہوتی ہے۔ ان کے پاس اتنا وقت ہی نہیں ہوتا کہ کسی اور طرف توجہ دے سکیں۔ اکثر عام لوگ ہی ایک دوسرے کے درد کو سمجھتے ہیں۔ یہ لوگ ہوتے سخت جان ہیں مگر دل گداز رکھتے ہیں۔ یہی تو ایک چیز ہے ان بیچاروں کے پاس!

بات شروع تو ایک ٹوپی سے ہوئی تھی مگر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں ٹوپیوں کے نرغے میں پھنس گیا ہوں۔ اس سے نکلنے کے لئے بات بڑھانا ہی پڑے گی۔ کچھ ٹوپیاں سیاسی ہوتی ہیں تو کچھ مذہبی۔ کچھ کسی خاص تہذیب کی علامت تو بعض ضرورت پڑنے پر ہی استعمال کی جاتی ہیں۔ ایک سیاسی ٹوپی نے تو انقلاب برپا کر دیا تھا۔ اس نے ایسی تاریخ رقم کی کہ رہتی دنیا تک اس کا ذکر ہوتا رہے گا۔ ہم سب جانتے ہیں یہ گاندھی کیپ ٹوپی ہے۔ معاف کیجئے کیپ کے ساتھ ٹوپی کا استعمال مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے۔ فصحاء کے نزدیک یہ بڑی غلطی ہے۔ لوگوں نے زبان کے ساتھ بڑے ناروا تجربات کئے ہیں۔ کبھی اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لئے اور کبھی لاعلمی کی وجہ سے جمع الجمع کا استعمال بہت ہونے لگا ہے مثلاً الفاظوں، جذباتوں اور خیالاتوں وغیرہ۔ اس میں ہندی والوں کا یوگ دان زیادہ ہے۔ ویسے میرا من 'باغ و بہار' میں بہت پہلے ہی جمع الجمع کا استعمال کر چکے تھے۔ بسا اوقات ہم معنی لفظ بڑھا دینے سے ذہنی سکون ملتا ہے جیسے سن لائٹ سوپ صابن۔ عوام

اردو زبان کا سیکولر کردار (حصہ اول)

دوسری زبانوں کے مقابلے اردو میں سیکولرزم کی پختہ روایت پر **پروفیسر مشیر الحسن** کا مقالہ

اردو کے مشہور و معروف شاعر **انور جلالپوری** کی شخصیت اور فن پر **وسیم بریلوی، نواز دیوبندی، منور رانا، افتخار امام صدیقی، مولانا عبدالعلی فاروقی، خوشبیر سنگھ شاد، سنجئے مصرا شوق، شفیع جاوید، احتشام افسر، شہریار** وغیرہ کے مضامین اور **بھگوت گیتا** کے منظوم ترجمے کے اقتباسات

اب جولائی ۲۰۱۸ء کے شمارے میں شائع کئے جائیں گے۔

اس کے علاوہ ہندوستانی زبانیں، غیر ملکی ادب، گزشتہ لکھنؤ اور دیگر تخلیقات

کو چھوڑیئے پڑھے لکھے لوگوں کو کہنے سنا ہوگا۔ جامعہ ہمدرد یونیورسٹی۔ بہرحال غلطی تو غلطی ہے خواہ کوئی کرے۔

ہاں تو بات گاندھی ٹوپی کی چل رہی ہے۔ یہ ٹوپی گاندھی جی سے منسوب ہے مگر ہماری آنکھوں میں وہ بے بال کا شہ سرہی کے ساتھ سمائے ہوئے ہیں۔ یہ حسرت ہی تھی کہ ان کی کوئی تصویر ٹوپی کے ساتھ ہاتھ لگ جائے۔ بھلا ہو انٹرنیٹ کا کہ ان کو گاندھی کیپ میں دیکھ ہی لیا۔ یہ ٹوپی گاندھی جی نے پہلی عالمگیر جنگ سے پہلے استعمال کی تھی جب راقم السطور کے باپ خود ایک بچہ تھے۔ اس ٹوپی نے ہندوستان کو انگریزوں سے آزاد کرا کے چھوڑا مگر شرمناک بات یہ ہے کہ ایک بدبخت نے ملک کو گاندھی جی سے ہی آزاد کر دیا۔ یہ ٹوپی کانگریس اور قوم پرستی کی علامت بن گئی۔ معلوم نہیں ایک بہت بڑے قوم پرست مولانا ابوالکلام آزاد اس ٹوپی کی گرفت سے کیوں کر آزاد رہے! ملک کی آزادی میں محض کانگریسی ٹوپی کا ہی ہاتھ نہیں تھا بلکہ مذہبی ٹوپیوں اور داڑھیوں کا برابر کا ساتھ تھا مگر اب تو گاندھی ٹوپی بھی بے اثر ہوتی جا رہی ہے۔

کل ہی کی تو بات ہے سیاسی دنگل میں جس ٹوپی کو پیدا ہوئے جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے اس نے سب ٹوپیوں کو ایسا پچھاڑا کہ دنیا دیکھتی رہ گئی۔ ظاہر تو یہی ہوتا ہے کہ تاریخ ساز یہ ٹوپی اپنی عظمت رفتہ میں مدہوش اور حالات حاضرہ سے نبرد آزما ہونے کی صلاحیت کھوتی جا رہی ہے۔

ٹوپی کا کوئی دین دھرم نہیں ہوتا۔ وہ سیکولر مزاج کی حامل ہوتی ہے۔ وہ ہر ماحول میں ڈھل جاتی ہے۔ یہی اس کی خاصیت ہے۔ اسے کسی مذہب سے کوئی سروکار نہیں مگر اس حقیقت کو کیا کریں کہ سب سے زیادہ ٹوپی کا استعمال مسلمان ہی کرتے ہی۔ باقی پگڑی باندھتے ہیں یا صافہ۔ کچھ لوگ ٹوپ سے سر چھپاتے ہیں۔ بابائے روم کے سر پر مختصر ترین ٹوپی نظر آتی ہے۔ یہ صرف مسلمان ہیں جنہوں نے ٹوپی کو لباس کا جز بنا لیا ہے۔ ابھی زیادہ زمانہ نہیں گزرا کہ ننگے سر بزرگوں کے سامنے آنا بے ادبی سمجھا جاتا تھا۔ چلئے مان لیا یہ سب کچھ صحیح! پھر تو اسے مسلمان یا اسلامی ٹوپی کہا جانا چاہئے مگر لوگوں نے ایک مخصوص وضع کی ٹوپی کو نمازی ٹوپی کا لقب دے دیا۔ حالی کی سر پر منڈھ جانے والی گول ٹوپی یا قدرے سخت باڑ کی گول ٹوپی جو بوہرا ٹوپی کے مماثل ہوتی ہے۔ اس اعزاز سے نوازی گئی ہے۔ عام طور پر اس ٹوپی کو پہن کر نماز پڑھتے ہیں اس لئے ہوشمندوں نے اسے نمازی بنا دیا۔ آدمی ایک حج کر لے تو اسے حاجی کہنے لگتے ہیں۔ برسوں نماز پڑھنے کے باوجود بھی لوگ اسے نمازی کہہ کر نہیں پکارتے مگر ٹوپی جو بوقت نماز سر پر ہوتی ہے وہ اس افتخار سے مشرف ہوئی۔ علامہ اقبالؔ یہ شکایت کرتے رہے 'من اپنا پرانا پاپی ہے، برسوں میں نمازی بن نہ سکا' واہ ٹوپی! تیرا کمال ہے کہ چشم زدن میں تو نے یہ خطاب جیت لیا۔

اسلام میں مشورے کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ کوئی بھی کام شروع کرنے سے پہلے مشورہ کرنا چاہئے۔ اس میں خیر ہی خیر ہے۔ کم ہی لوگوں کو علم ہوگا کہ ٹوپی اور مشورے میں ایک گہرا تعلق ہے۔ مثل مشہور ہے کہ اگر کوئی نہ ملے تو اپنی ٹوپی ہی سے مشورہ

اردو زبان کا سیکولر کردار (حصہ دوم)

اردو ادب میں اتر پردیش کے غیر مسلم ناول نگاروں کی خدمات پر **نعمان قیصر** اور فارسی ادب میں ہندو شعراء کی خدمات پر **ڈاکٹر سعدیہ جعفری**، کملیشور کی ادبی خدمات پر **مشرف عالم ذوقی** اور بلونت سنگھ کے فن پر **رضوان انصاری**، تصوف اور ہندوستانی روحانیت پر **ڈاکٹر نریش** کے مضامین

گلزار دہلوی، رتن سنگھ، چندر بھان خیال، دیپک بدکی، راجیو پرکاش ساحر، وشال کھلر، خوشبیر سنگھ شاد، پونم کوثر، رینو بہل، منیش شکلا، سیاسچدیو، رام پرکاش بیخود، پی پی شریواستو رندؔ، اویناش امن، رمیش پانڈے شکھر، دیپک نشاط وغیرہ کی تخلیقات، ہندوستانی زبانیں، غیر ملکی ادب، گزشتہ لکھنؤ اور دیگر مشمولات

اگست ۲۰۱۸ء کا 'نیا دور' اردو زبان کے انہیں اوصاف پر مبنی ہوگا

کرلو۔ میر تقی میر لکھتے ہیں:

کہتے ہیں اپنی ٹوپی سے بھی مشورت کرو
کر قصد ترک سر سے کبھی شرم مت کرو

سبھی ٹوپیاں مہذب ہوتی ہیں مگر الگ الگ تہذیب کی نمائندگی کرتی ہیں۔ اسی لئے ان کی وضع قطع مختلف ہوتی ہیں۔ لکھنؤ اپنی تہذیبی روایات کے لئے مشہور ہے۔ وہاں کی نزاکت اور تکلف سے سب واقف ہیں۔ سرزمین لکھنؤ کی روایتی نازکی کا یہ عالم ہے کہ فرش مخمل پر پاؤں چھل جاتے ہیں بلکہ نسیم سحری کے عطر بیز جھونکے رنگ میلا کر دیتے ہیں جب صورت یہ ہو تو سرِ نازک ٹوپی کے بارِ گراں کا متحمل کہاں ہوسکتا ہے! چنانچہ لطیف و باریک ململ کی دو پلو ٹوپی کا سئہ سر تک رسائی حاصل کر سکی۔ سر پر اس کی گرفت اتنی ہلکی ہوتی ہے کہ احساس تک نہیں ہوتا۔

ٹوپی کا کوئی موسم نہیں ہوتا مگر بعض ٹوپیاں موسمی ہوتی ہیں۔ موسم سرما میں اونی اور گرم بالوں والی ٹوپیوں کا استعمال بڑھ جاتا ہے۔ بچے بوڑھے، عورت مرد سبھی سردی سے بچنے کے لئے اونی ٹوپی یا ٹوپے لگاتے ہیں۔ گنجوں کو اس کی ضرورت کچھ زیادہ ہی ہوتی ہے۔ سر چھپانے کے لئے بعض لوگ ہر وقت کسی نہ کسی طرح کی ٹوپی لگائے رہتے ہیں یعنی ضرورت انہیں ٹوپی لگانے پر مجبور کر دیتی ہے۔ ایسی ٹوپی کو ہم احتیاجی ٹوپی کہہ سکتے ہیں۔ گنجے پن کا کوئی علاج نہیں ہے اور جو علاج ہے یعنی سر پر بالوں کی ایکھاگانا وہ بہت مہنگا نسخہ ہے۔ اسی لئے اب گنج کی نمائش میں انہیں تکلف نہیں ہوتا اور خود کو ٹوپی کی علت سے باز رکھتے ہیں۔ شدید گرمی میں جب انڈا چھوڑ دیتی ہے اور کھوپڑی پلپلانے لگتی ہے تو لوگ چھتری لگا لیتے ہیں یا پھر تنکوں کا ٹوپ لگاتے ہیں جسے Straw Hat کہتے ہیں۔ تغیر زمانہ سرپوش کی ہیئت بدلتا رہتا ہے۔ ٹوپ، ٹوپی، ٹوپا سب وقت کی ضرورت ہیں۔ کج کلاہ ترچھی ٹوپی والے/ والی کو کہتے ہیں۔ کنایتاً معشوق کے لئے بھی بولا جاتا ہے اس کی کج کلاہی اور کج نگاہی قیامت خیز ہوتی ہے:

ناصح کو بلاؤ مرا ایمان سنبھالے
پھر دیکھ لیا اس نے قیامت کی نظر سے

مریض عشق کے لئے یہ کج نگاہی تیر نیم کش سے کم نہیں ہوتی۔ کج کلاہی میں ایک بانکپن ہوتا ہے۔ ایک سادہ لوح کیا جانے بانکپن کیا ہوتا ہے! سیدھے سادہ لوگ سیدھی ٹوپی لگاتے ہیں۔ ان کا مقصد صرف سر پوشی ہوتا ہے، خودنمائی نہیں۔ تن من کا سدھار ہی ان کا مشن ہوتا ہے۔ یہ کجی ٹوپی کی ہو، نگاہ کی ہو یا ہونٹوں کی، ہوتی بڑی قاتل ہے۔

اب ایک ایسی ٹوپی کا ذکر کرتے ہیں جو پہنی کم اور پہنائی زیادہ جاتی ہے۔ یوں تو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں شیروانی اور ٹوپی کا رواج عام ہے تاہم اکثریت گیسوئے تابدار کی نمائش کی خاطر ٹوپی کو زینت سر نہیں بننے دیتے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ طلبہ خود ٹوپی نہ لگائیں مگر دوسروں کو پہنا کر دم لیتے ہیں۔ یہ منظر طلبہ کی یونین کی طرف سے منعقدہ مشاعروں میں نظر آتا ہے۔ اگر شاعر بغیر ٹوپی اسٹیج پر آ گیا تو اس کی شامت ہی آ گئی۔ ایک نعرہ بلند ہوتا ہے اور یہ جاری رہتا ہے جب تک شاعر مانگ تانگ چھوٹی بڑی ٹوپی سر پر نہ رکھ لے۔ وہ بیچارہ بن سنور کر اسٹیج پر آتا ہے مگر الٹی سیدھی ٹوپی لگانے سے اس کا حلیہ بیرنگ اور قافیہ تنگ ہوجاتا ہے۔ اگر وہ مزاحمت کرتا ہے تو اس کی محاوراتی ٹوپی اتار دی جاتی ہے۔ یعنی اتنی ہوٹنگ ہوتی ہے کہ گھبرا کر وہ اپنی نشست لے لیتا ہے یا پھر ٹوپی لگا لیتا ہے۔ صرف مضبوط اعصاب والا شاعر ہی یہ جھپٹ جھیل کر غزل سنانے کی ہمت جٹا پاتا ہے۔ جس نے یہ امتحان پاس کرلیا، سمجھو وہ پاس ہوگیا۔ دنیا کے کسی بھی اسٹیج پر ناکام نہیں ہوسکتا۔

یہی منظر علی گڑھ کی نمائش کے مشاعروں میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ وہاں بھی در اصل یہی طلبہ ہوتے ہیں۔ بہرحال تسلیم کرنا پڑے گا کہ شاعر کی جو درگت بنتی ہے وہ تو اپنی جگہ مگر ٹوپی کی بھی بے حرمتی کچھ کم نہیں ہوتی۔

ٹوپی کی جلوہ گری صرف عام زندگی تک محدود نہیں۔ وہ میدان کارزار میں بھی اپنی اہمیت کو تسلیم کرا چکی ہے۔ ایک دور وہ بھی تھا جو فوجیں خود (لوہے کی ٹوپی) و زرہ بکتر سے آراستہ میدان جنگ میں آمنے سامنے صف آرا ہوتی تھیں۔ شمشیر و سناں اور توپوں سے قوت کا مظاہرہ کیا جاتا تھا۔ تب پتہ چلتا تھا کہ کس میں کتنا دم ہے۔ یہ ایٹمی جنگ کا زمانہ ہے۔ گھر بیٹھے دور مار میزائیل داغ دیا اور تباہی مچادی۔ یہ بھی کوئی جنگ ہوئی کہ انسانی قوت کا مظاہرہ ہی نہ ہوسکا۔ یہ معلوم ہی نہ ہوسکا کہ کتنا زور بازوئے قاتل میں ہے۔ اب خود کے دن تو لد گئے مگر اس کی جگہ ہیلمٹ نے لی لے ہے۔ یہ میدان کارزار میں نہیں شاہراہ عام پر خاص کر دوپہیہ گاڑی سوار استعمال کرتے ہیں۔ مقصد دونوں کا حفاظت سر ہے۔ اب اس ہیلمٹ کا دائرہ بڑھ کر کھیل کے میدان تک پہنچ گیا ہے۔ یہ ہے ٹوپی کا جلوہ صد رنگ

ٹوپی کسی کی میراث نہیں جس کو جو ٹوپی اچھی نہیں وہ پہن لی۔ سفید ہو یا کالی، زعفرانی ہو یا سبز، کتھئی ہو یا سرمئی، ململ کی ہو یا مخمل کی۔ کھدر کی ہو یا اطلس کی۔ وہ سر سے منڈھی ہو یا اونچی باڑھ کی۔ یہ خالصتاً اپنی پسند کا معاملہ ہے۔ بعض حضرات نے اپنے مسلکی اظہار کے لئے مخصوص رنگ روپ کی ٹوپیاں وضع کر لی ہیں۔ یہ جمہوریت کا زمانہ ہے۔ ٹوپی کا انتخاب ہمارا حق ہے۔ اتنا ہی یہ حق بھی حاصل ہے کہ ہم برہنہ سر ہیں یا سر بہ کلاہ!

❑❑❑

آپ کے خطوط

''نیا دور'' کے تازہ شمارہ کے مطالعہ کے بعد چند باتوں کا اظہار لازمی سمجھتی ہوں۔ پہلی بات یہ زندہ قومیں کبھی بھی لاش کو کندھے پر نہیں ڈھوتیں بلکہ زمانے اور وقت کے تقاضوں کے مطابق روایت شکنی کا فریضہ انجام دیتی ہیں۔ اردو زبان وادب کے تناظر میں دیکھیں تو آج اردو قارئین کے حد درجہ مایوسی نظر آتی ہے۔ اردو قارئین کی کم ہوتی تعداد ہمیں اس جانب غور فکر کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ ایسے میں رسائل کے مدیران کی ذمہ داریاں حد درجہ بڑھ جاتی ہیں۔ عصر حاضر میں شائع ہونے والے بیشتر اردو رسائل تعفن زدہ لاشیں ڈھو رہے ہیں۔ دیانت داری اور احساس ذمہ داری کا جنازہ اٹھ چکا ہے۔ ہر طرف جانب داری اور مصلحت پسند عام ہے۔ رسالوں میں شائع ہونے والے خشک قسم کے مضامین اور غیر معیاری مشمولات دیکھ کر دل مغموم ہو جاتا ہے۔ تحقیق وتنقید کے نام پر چبائی ہوئی ہڈیوں اور اگلے ہوئے نوالوں کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ اکیڈمک ضرورت کے تحت سرقہ بازوں کی تحریریں دیکھ کر کلیجہ منھ کو آتا ہے۔

ایسے مایوس کن حالات میں سہیل وحید صاحب کی روایت شکن کاوشیں تازگی بخشتی ہیں۔ یہی وجہ کہ ان کی دوراندیشی اور بالغ نظری کو زمانہ سلام کر رہا ہے۔ آپ نے ''نیا دور'' کو صحیح معنوں میں نئے دور کے تقاضوں سے وابستہ کر کے اس کی رگوں میں تازہ لہو دوڑایا ہے۔ آپ کی بیش بہا کاوشیں اس مشہور زمانہ رسالے کے پرانے قارئین کی بازیافت خوش اسلوبی سے کر رہی ہیں۔ دوسری اہم بات یہ کہ زبان کے بغیر ادب کا تصور بے معنی ہے۔ اس لیے پہلے زبان کی فکر لازمی ہے۔ امید کرتا ہوں کہ دوسرے اداروں کے لوگ بھی سہیل وحید صاحب کی بنائی ہوئی اس راہ صواب کو اختیار کریں گے۔

تازہ شمارے کی خاص خوبی یہ ہے کہ اس میں تخلیقی ادب کو خصوصی اہمیت دی گئی ہے۔ خاص طور پر غیر افسانوی ادبیات کو جس طرح سے نظر انداز کیا گیا، وہ واقعی قابل افسوس ہے۔ رپورتاژ جیسی کارآمد صنف

نیا دور کے مختلف نمبر کتابی شکل میں

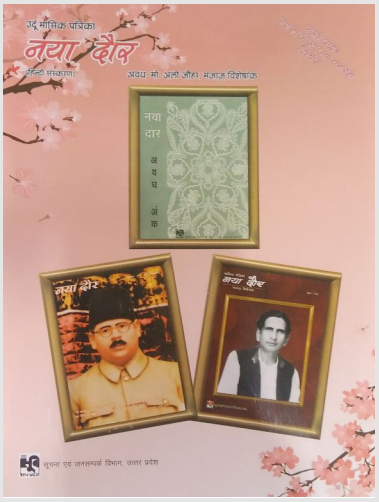

'نیا دور' نے گزشتہ برسوں میں کئی اہم اور دستاویزی نمبر شائع کئے ہیں۔ انہیں میں سے 'اودھ نمبر، محمد علی جوہر نمبر اور مجاز نمبر' بھی شامل ہے۔ پہلے اسے الگ الگ شائع کیا گیا تھا لیکن اب اسے ایک کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ ادب وتاریخ سے دلچسپی رکھنے والے جو قارئین کرام اسے خریدنا چاہتے ہیں، وہ نیا دور سے براہ راست یا بذریعہ ای میل رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔ اس کی قیمت ۲۰۰/روپے ایڈوانس دینی ہوگی اور اسے منگوانے کیلئے ڈاک یا کوریئر پر آنے والا خرچ ۵۰/روپے ملا کر کل قیمت ۲۵۰/روپے خریدار کے ذمہ واجب الادا ہوگی۔

ایڈیٹر ماہنامہ 'نیا دور'

کے ساتھ بھی انصاف نہیں کیا گیا۔ خوشی کا مقام ہے کہ آپ نے نوجوان لکھنے والوں کی تحریریں شامل کی ہیں۔ رپورتاژ کے فن وروایت کے متعلق طلعت گل صاحبہ کا مضمون قابل تحسین ہے۔ سفینہ بیگم اور نور فاطمہ کی تحریریں تخلیقی حسن سے آراستہ و پیراستہ ہیں۔ نوجوان مصنفہ سفینہ بیگم کے رپورتاژ ''یہ میرا چمن ہے میرا چمن میں اپنے چمن کا بلبل ہوں'' نے علی گڑھ کی پرانی یادیں تازہ کر دیں۔ انہوں نے بہت دلچسپ انداز میں وہاں کا نقشہ کھینچا ہے۔ البتہ رواروی میں لکھی گئی صالحہ صدیقی کی تحریر نے مجھے مایوس کیا۔ ان کے خشک طرز تحریر سے مضمون کمزور ہو گیا ہے۔ نوجوانوں کو زود نویسی کے مرض سے خود کو محفوظ رہنے کی ضرورت ہے۔ نجیب انصاری کا انداز بیان بھی کافی پسند آیا۔ دودھ ناتھ سنگھ کو پیش کیا گیا خراج عقیدت بھی ایک قابل تحسین پہل ہے۔

محبوب حسن کا طنزیہ ومزاحیہ مضمون ''ایک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے'' میں غضب کی انشا پردازی موجود ہے۔ ایک عاشق کے زخم خوردہ جذبات واحساسات کو انتہائی خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔ لیکن کہیں کہیں یاسیت کی کیفیت بھی پیدا ہو گئی ہے۔ موصوف کی دلکش نثر اور پر لطف طرز نگارش نفس مضمون کی ادائیگی میں بے حد معاون ثابت ہوئی ہے۔ آج کل ایسی سادہ وروان نثر لکھنے والے خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ دسمبر کے شمارے میں شائع ان کے مضمون ''اللہ کے نام پر پڑھ لے بابا'' نے بھی اپنی فکری وفنی خوبیوں کے سبب مجھے خاصہ متاثر کیا تھا۔ موصوف نے اس مضمون میں تہذیبی اور علمی زوال کو دلکش پیرائے میں موضوع بحث بنایا تھا۔ ایک پرخلوص مشورہ ہے کہ رسالے میں اگر کلاسیکی ادبیات کو بھی تھوڑی سی جگہ مل جاتی تو مناسب ہوتا۔ دعا ہے کہ سہیل وحید صاحب اور جملہ اراکین کی یہ کوششیں اردو زبان ادب کے حق میں تادیر جاری رہیں اور ''نیا دور'' کی روشنی ملک کے کونے کونے تک پہنچ سکے۔ شکریہ

ڈاکٹر فرحین رضوی
(فیض آباد، یوپی)

راقم الحروف آپ کے رسالے 'نیادور' کا پرانا قاری ہے۔ معمولی تلاش کے بعد ذاتی لائبریری میں 'نیادور' کی خصوصی اشاعتیں مل گئیں۔ مسعود حسن رضوی ادیب نمبر، مولانا عبد الماجد دریا آبادی نمبر، فراق گورکھپوری نمبر اول و دوم، قومی یکجہتی نمبر، اودھ نمبر اول ودوم، قرۃ العین نمبر، شکیل بدایونی نمبر، مجاز نمبر، علی برادران نمبر، جانثار اختر نمبر وغیرہ۔ عام شماروں کی تو گنتی ہی نہیں۔ امیر احمد صدیقی، شاہ نواز قریشی، امجد حسین اور ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی کے زمانے کے کئی شمارے محفوظ ہیں۔ دراصل پچھلے چند سالوں میں 'نیادور' اپنی اشاعت کے معاملہ میں خاصہ بدنام رہا۔ اس کے باوجود احقر 'نیادور' کا زرِ سالانہ ارسال کرتا رہا۔ ایک سال تو صرف دو شمارے ملے مگر میں نے شکایت نہیں کی کہ دو شمارے بھی زرِ سالانہ میں ادبی اعتبار سے مہنگے نہ تھے۔ اس بار زرِ سالانہ ادا کرنے کے بعد فروری کا تازہ شمارہ ملا۔ شمارہ دیکھ کر پہلے حیرت اور پھر مسرت ہوئی۔ وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ نیادور کا روپ ایسا بھی ہوسکتا ہے۔ مبارکباد قبول کیجئے۔ اپنے محدود مطالعہ کی وجہ سے راقم الحروف آپ کی علمی اور ادبی خدمات سے واقف نہیں مگر تازہ شمارہ کہہ رہا ہے کہ آپ اس میدان میں نئے ہرگز نہیں۔ اردو کی مایۂ ناز ادیبوں اور شاعروں کی تاریخ پیدائش کا سلسلہ جاری رکھیں۔

یعقوب الرحمٰن

یوَت مال (مہاراشٹر)

آپ کا ارسال کردہ نیادور موصول ہوا۔ یاد فرمائی کا دلی شکریہ۔ رسالہ نیادور کا تازہ شمارہ میرے روبرو ہے۔ تازہ شمارہ دیکھ کر اطمینان اور دل کو بہت خوشی حاصل ہوئی۔ میں آپ کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ آپ کو سعادت آمیز توفیق دے۔ آپ لوگ اسی خیر وخوبی کے ساتھ یہ سلسلہ جاری رکھیں۔

رسالہ کو خوبصورتی سے سجانے کے لئے آپ نے بہت محنت اور کامیاب کوشش کی ہے۔ سچ ہے کہ اگر مدیر باصلاحیت اور ادب دوست ہو تو کسی بھی رسالے کو نئی زندگی مل جاتی ہے۔ اللہ کرے آپ ہر حال میں ثابت قدم رہیں۔

آپ کے رسالہ میں سبھی مشمولات، مضامین، غزلیات اور افسانے کاغذ پر بڑے سلیقے سے سجائے گئے ہیں۔ دیکھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ آپ کا رسالہ دورِ جدید میں شائع ہونے والا اردو کے کسی بھی رسالے سے کم نہیں ہے۔

میں آپ کو خوبصورت رسالہ شائع کرنے پر دل کی گہرائیوں سے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ رسالہ نیادور کے معیار اور بڑھتی ہوئی مقبولیت پر آپ کی خدمت میں بہت بہت مبارکباد!

کے۔ انیس اظہر

ویلور

نیادور کا شمارہ موصول ہوا جس کے بہت بہت شکرگزار ہوں شمارہ کی تزئین ایسی تھی کہ شمارہ پہچان میں نہیں آرہا تھا۔ ایڈیٹر کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ رسالہ کی شکل وشباہت بھی بالکل بدل گئی۔ لگتا ہے رسالہ قید سے آزاد ہو چکا ہے۔ نئی نئی چیزوں اور مضامین کا اضافہ ہوا ہے۔ پرانے اور نئے مشہور لوگوں کا تصاویر کے ساتھ پیدائش اور وفات کی تاریخ کا سلسلہ نیا ہے۔ سابق ایڈیٹر ماہنامہ نیادور وضاحت حسین رضوی صاحب نے بڑے بڑے مشہور لوگوں کا خصوصی نمبر نکال کر نام پیدا کیا۔ ان کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے مگر ماہنامہ نیادور ویسا نہیں تھا جیسا اس وقت ہے۔ آپ کے دور میں ماہنامہ کا نام تو وہی ہے لیکن اندر مواد اور مضامین کی ترتیب بدل گئی۔ سب کچھ ہی نئے ڈھنگ سے کر دیا ہے۔ لگتا ہی نہیں ہے کہ وہ نیادور ہے۔ کوئی دوسرا رسالہ دیکھ رہا ہوں۔ امید ہے کہ رسالہ اب پابندی سے موصول ہوگا۔ آپ کی پہچان اور اطمینان کے لئے شمس الرحمن فاروقی صاحب کا رسالہ میں شائع شدہ خط ہی کافی ہے۔ رسالہ بہت ہی پسند آیا۔ اس کا طرز بالکل انوکھا ہے۔ آپ نے اسے دوسرے رسالوں سے منفرد کر دیا ہے۔

اقبال احمد خاں

گیا (بہار)

نیادور کے پانچ شمارے ایک ساتھ دستیاب ہوئے۔ عنایت کثیر کا شکریہ۔ نیا دور میں پہلے کی بہ نسبت تبدیلی محسوس ہوتی ہے۔ اسی طرح ترتیب و توازن برقرار رہے تو بہتر ہے۔ اسے گروہ بندی اور عصبیت کا شکار نہ ہونے دیں۔ کلام کی اشاعت اس کے معیار پر منحصر ہونی چاہئے۔ عہد حاضر میں زیادہ تر مدیروں کو کلام نہیں نام چاہئے۔

بلاخوف وتردید یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ آپ کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہے کہ آج نیادور اس منزل پر پہنچ چکا ہے۔

عبرت مچھلی شہری

جونپور

مارچ ۲۰۱۸ء کا نیا شمارہ موصول ہوا۔ سرورق دیکھ کر دل خوش ہوگیا۔ رپورتاژ پر پہلی بار اس قدر جامع اور مانع رسالہ دیکھا بلکہ اردو دنیا میں رپورتاژ جیسے موضوع پر کوئی رسالہ اس ترتیب سے نہیں دیکھا جس حسن سے آپ نے اسے سجایا اور سنوارا ہے۔ اداریہ سے لے کر ہر اک مضمون اور افسانے اعلیٰ درجے کے ہیں۔ بازدید بھی عمدہ ہے۔ یونیورسٹیوں کو کور کرنا آسان بات نہیں ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ آپ نے کافی محنت ومشقت کی ہوگی۔ آپ کی یہ مشقت اہل علم و دانش کے لئے کارآمد ثابت ہوگی۔ مزاحیہ عمدہ ہے۔ قدیم لکھنؤ کی آخری بہار، مرزا جعفر حسین کی نثر کا تو کوئی جواب نہیں نیز لکھنؤ جیسے شہر کے سلسلہ میں اس قدر بہترین معلومات شاید ہی کہیں اور سے میسر ہوسکے۔

سید علی مہذب رضا

سرسی، سنبھل

اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ جی سنت کبیر نگر میں 'اسکول چلو مہم' کا آغاز کرتے ہوئے (۳؍اپریل ۲۰۱۸ء)

اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ جی لکھنؤ کی ایک خاتون کو رانی لکشمی بائی بہادری انعام سے نوازتے ہوئے (۲۹؍مارچ ۲۰۱۸ء)

اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ جی جالون میں منعقد ایک پروگرام میں مستفید کو سرٹیفکٹ دیتے ہوئے (۱۳؍اپریل ۲۰۱۸ء)

उर्दू मासिक
नया दौर
पोस्ट बॉक्स सं0 146,
लखनऊ – 226 001

صدر جمہوریۂ ہند جناب رام ناتھ کووند وارانسی میں ایک پروگرام کا افتتاح کرتے ہوئے
ساتھ میں اتر پردیش کے گورنر جناب رام نائیک اور وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ جی (۲۶/مارچ)

اتر پردیش کے گورنر جناب رام نائیک وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ جی سے ملاقات کے دوران (۱۵/اپریل ۲۰۱۸ء)

نیا دور کے شمارے اب A.H. Wheeler لکھنؤ کے سبھی بک اسٹالوں پر بھی دستیاب ہیں

For Latest Issues of Naya Daur visit at www.information.up.nic.in

वर्ष : 72 अंक 12
अप्रैल 2018
मूल्य : 10 रु./–
वार्षिक मूल्य : 110 रु./–

पंजीयन संख्या : 4552/51
एल0 डब्लू/एन0 पी0/101/2006–08
ISSN 0548-0663

प्रकाशक व मुद्रक, अनुज कुमार झा, निदेशक द्वारा सूचना एवं जनसम्पर्क विभाग, उ.प्र. के लिए प्रकाश पैकेजर्स, 257 गोलागंज, लखनऊ से
मुद्रित एवं प्रकाशन प्रभाग, सूचना एवं जनसम्पर्क विभाग, उ.प्र., सूचना भवन, पार्क रोड, लखनऊ–226001 से प्रकाशित–सम्पादक, **सुहेल वहीद**